مارچ 2007

قیمت : -/10 روپے

اردو دنیا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

9 تا 11 فروری 2007 کو قومی اردو کونسل کی جانب سے ایک سہ روزہ سیمینار ''نوآبادیاتی تجربہ اور اردو ادیبوں کا ردعمل: اکبرالہ آبادی کے خصوصی حوالے سے'' الہ آباد میں منعقد ہوا۔ تصویر میں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی شرکا سے خطاب کرتے ہوئے۔

جناب فضیل جعفری تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر میں (دائیں سے) محترمہ نفہ، پروفیسر لطف الرحمن اور پروفیسر شہناز نبی (وائس چیئرمین، مغربی بنگال اردو اکادمی) کو دیکھا جاسکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب پرویز شہریار سامعین سے مخاطب ہیں جب کہ اسٹیج پر جناب شمس الرحمن فاروقی، جناب فضیل جعفری اور پروفیسر علی احمد فاطمی تشریف فرما ہیں۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔3 مارچ 2007

مدیر: رشمی چودھری

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون:26103938, 26103381
فیکس:26179657, 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون:26169416, 26109746

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ...... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات ...... ادارہ 4

زبان اور تعلیم

- اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف ...... شمس الرحمن فاروقی 5
- جدید تعلیم— عصری ضرورتیں اور اردو ...... عبدالستار دلوی 7
- سائبر اسپیس اور اردو زبان کی تدریس ...... خواجہ اکرام 10
- بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک ...... راج رانی، رنجنا اروڑا 13
- قاری کی بازیافت ...... شمبھوناتھ 16
- اردو اور ہندی کا لسانی ارتباط ...... انیس چشتی 18
- ویمنس اسٹڈیز پروگرام— خواتین کے مسائل کا حل ...... آمنہ تحسین 20

ادب

- دیوان غالب— ایک تخلیق نواز ماخذ ...... زبیر رضوی 21
- منیر نیازی— غزل کے آئینے میں ...... سرور الہدیٰ 24
- سہمے ہوئے ...... مہیپ سنگھ 30

صنعت و حرفت

- پلاسٹک ...... محمد خلیل 36

دفتری انتظامیہ

- دفتر، اس کی خدمات اور طریق کار ...... منیر انجم 38

شخصیات

- سروجنی نائیڈو ...... افتخار الزماں 43
- اسد بھوپالی ...... رشید انجم 45

سفرنامہ

- جرمنی کا سفر ...... شائق احمد یحییٰ 47

کیریئر

- ہندوستانی بحریہ ...... الیاس انور 54

ہماری مطبوعات سے

- ذہانت اور رجحان ...... سید محمد محسن 57

اردو خبرنامہ ...... ادارہ 60

تبصرہ و تعارف ...... کتابوں پر تبصرے 71

بچوں کا گوشہ

- جگدیش چندر بوس ...... دلیپ ایم سالوی 78

آپ کی بات

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش۔**

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ بروقت مل جاتا ہے۔ فروری 2007 کا شمارہ 31 جنوری کو موصول ہوا۔ ''اردو دنیا'' کا گیٹ اپ اور سیٹ اپ بہت خوب ہے۔ اس کے مشمولات کو جن ذیلی عنوانات سے سجایا جاتا ہے اور ان کے تحت جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ اس عالم گیریت کے دور میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ رسالہ اردو والوں کو عصری شعور و آگہی عطا کر رہا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا کالم ''اچھی اردو: روزمرہ محاورہ، صرف'' بہت دلکش اور فکر انگیز ہے۔ یہ کالم زبان، الفاظ اور لسانیات سے متعلق معلومات افزا ہے۔ محمد حسن فاروقی نے ''درس و تدریس کے عصری تقاضے'' میں درس و تدریس کا عصری انداز سے محاکمہ کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں معلم کا رول مزید حرکیاتی ہونا چاہیے۔ اردو ماحول سے فارغ طلبہ نہ تحریر میں ماہر ہوتے ہیں اور نہ تقریر میں لہٰذا بچوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ''ماحولیات'' کو رسالے میں جگہ دینا خوش آئند عمل ہے۔ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام نے بھی یوم جمہوریہ کی تقریر میں بچوں اور ماحولیات پر زور دیا تھا۔ اس رسالے میں وہ سب کچھ ہے جو اکیسویں صدی کا قاری چاہتا ہے۔ ''اردو دنیا'' اکیسویں صدی کے اردو قارئین کی ضرورت ہے۔ مزید برآں عام مسابقتی امتحانات کے لیے ''اردو دنیا'' ممد و معاون اور سود مند ہے۔ مشمولات کی جدت و ندرت اور موضوعات کا انتخاب خوب سے خوب تر کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

■ **حبیب الرحمن چغانی، حریم، ملت روڈ، دودھ پور، علی گڑھ۔ 202002**

''اردو دنیا'' فروری 2007 میں ڈاکٹر مشتاق احمد کا مضمون ''اردو میں وضاحتی کتابیات'' خاصا معلومات افزا ہے۔ کتابیات کی تعریف و توضیح بڑی تفصیل سے کی ہے۔ اگر لفظ ''اشاریہ'' اور ''کیٹلاگ'' کی بھی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ مقالہ نگار کے انداز بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتابیات اور کیٹلاگ مترادف الفاظ ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ اگر دونوں کے فرق کو واضح کر دیا جاتا تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ اردو زبان میں کتابیات کی ترتیب و تدوین میں محمد ضیاء الدین انصاری، سابق ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کوئی مجہول شخصیت نہیں۔ تعجب ہے کہ مرتبین کی اس تفصیل میں ان کا نام کوئی جگہ نہ پا سکا۔ ''فکر و نظر'' علی گڑھ نے سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد پر خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ ان سب میں ضیاء الدین انصاری کی مرتب کی ہوئی کتابیات اور اشاریے شامل ہیں۔ ''اردوئے معلی'' کے مضامین کی فہرست ''آجکل'' اگست، ستمبر 1981، نقش حسرت (فہرست) ''آجکل'' اگست، ستمبر 1981 اور آزاد نمبر ''آجکل'' نومبر 1988 انھی کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مزید برآں ''نقوش ذاکر'' اور ''آثار آل احمد سرور'' مرتبہ ضیاء الدین انصاری خدا بخش لائبریری کی مطبوعات میں شامل ہیں۔

■ **تابش رانچوی، ہندپڑھی، سی. پی. روڈ، رانچی۔ 834001**

فروری 2007 کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ محترم شمس الرحمن فاروقی کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ''کوکنگ گیس'' مضمون شائع فرما کر آپ لوگوں نے خواتین پر بڑا احسان کیا ہے۔ آئے دن گیس سے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ خواتین اس مضمون کو پڑھ کر اپنی عملی زندگی میں ہونے والے حادثات سے بچنے کی کوشش کریں گی۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو اس بات پر مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس ''انٹرویو کو بارہ سال تک محفوظ رکھا۔'' ''اردو دنیا'' کا سرورق جتنا خوب صورت ہے اتنا ہی خوب صورت اس میں مواد بھی ہے۔ یہ رسالہ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے ہر دل عزیز ہے۔

■ **رضوان خان، 96، شیخ سرائے، سیتاپور (یو. پی.)**

''اردو دنیا'' فروری 2007 موصول ہوا۔ اداریے میں آپ نے بجا فرمایا ہے کہ اردو کے روایتی مراکز دہلی اور لکھنؤ میں اردو کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ غیروں سے ہمدردی کی توقع کرنے کے بجائے اگر ہم خود اپنا محاسبہ کریں تو پائیں گے کہ ہم اردو والے خود بھی اردو کا حق ادا کرنے میں کوتاہی برت رہے ہیں لیکن یہاں یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ حکومتوں اور ان سے وابستہ ایجنسیوں کی ذمہ داری بھی زبان کے فروغ و اشاعت کے حوالے سے کم نہیں ہوا کرتی کیونکہ حکومتیں اور ایجنسیاں عوام کے تئیں جواب دہ ہوتی ہیں۔

''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' کے عنوان سے شروع کیا گیا کالم بہت اچھا ہے۔ محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب جیسے مستند اردو داں کے جوابات قابل قدر ہوتے ہیں۔

■ **محمد عطاء اللہ ساکن خیروا، ڈھاکہ، مشرقی چمپارن۔ بہار۔845418**

''اردو دنیا'' کے شمارے پابندی سے موصول ہو رہے ہیں۔ فروری 2007 کے شمارے کا سرورق دلکش ہے۔ مشمولات میں آپ کی معیار بندی لائق ستائش ہوتی ہے۔ ماہنامہ ''اردو دنیا'' وہ واحد رسالہ ہے جو ہر مذاق و مزاج کے قاری کے لیے معلوماتی اور دلچسپ مواد فراہم کرتا ہے۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' تشنگان علم و ادب کے لیے معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قارئین اس سے خوب استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کے لیے محترم شمس الرحمن فاروقی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دیگر مضامین میں محمد حسن فاروقی کا ''درس و تدریس کے عصری تقاضے'' وجے دیو سنگھ کا ''اردو فاصلاتی نظام تعلیم— سمت و رفتار'' اور ڈاکٹر مشتاق احمد کا ''اردو میں وضاحتی کتابیات'' نے بہت متاثر کیا۔ ''فکر و تحقیق'' کے خصوصی شمارے داغ نمبر پر محمد شاہد پٹھان کا مضمون ''تفہیم داغ کی ایک تازہ کوشش'' اور اسی شمارے پر ڈاکٹر ظہیر رحمتی کا تبصرہ پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ ان اصحاب نے کتنی محنت اور باریکی سے اس خاص نمبر کا مطالعہ کیا ہے۔ مدحت لقمان کا مضمون ''کوکنگ گیس'' خصوصاً عورتوں کے لیے زیادہ کارآمد اور مفید ہے۔ جناب مظہر امام کی نظم ''دو ہزار چھ'' گذشتہ سال میں ہم سے جدا ہونے والے خادمان ادب کو بہترین خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا انٹرویو ''نظیر صدیقی سے گفتگو'' اور احمد کفیل کی ''آٹھویں کل ہند اردو کتاب میلہ'' کی روداد بھی جامع اور معلوماتی ہے۔ کتابوں پر تبصرے کے تحت بحیثیت مبصر ڈاکٹر فیروز عالم اور محمد عمر رضا نے متاثر کیا۔ اس معیاری اور خوب صورت اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **شکیل احمد فریک (صحافی) خالق ہاؤس، شیخ پور، گورکھ پور۔273005**

فروری 2007 کا ماہنامہ ''اردو دنیا'' نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے یہ شمارہ بے حد پسند آیا۔ اس شمارے میں شائع شدہ سبھی مضامین، مراسلات، اداریہ وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **بابر نقوی الہاشمی، B-2/60-61، سعود پارک، نئی دہلی۔59**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (فروری 2007) موصول ہوا۔ حسین اور دلکش سرورق کے ساتھ کئی مضامین بے حد پسند آئے۔ آپ کی کاوشیں بارآور ہیں۔

''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' بہت کارآمد سلسلہ ہے۔ ہماری جانب سے اس معیاری اور خوب صورت اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چھنا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی، جھارکھنڈ۔834001**

خوب صورت اور دلکش سرورق دیکھ کر ہی قاری کی توجہ ''اردو دنیا'' کی جانب مرکوز ہو جاتی ہے اور قاری اسے خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ مخمور سعیدی صاحب نے رسالے کے اعزازی مدیر کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ مخمور صاحب کا صحافت سے دیرینہ رشتہ ہے۔

مرزا حامد بیگ سے ڈاکٹر فیروز عالم کی گفتگو اگرچہ طویل ہے مگر مرزا صاحب نے تمام سوالات کا جواب مدلل دیا ہے۔ ان کے جواب سے قاری مطمئن ہو جاتا ہے۔ محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کا کالم بے حد مفید ہے۔ طالب علموں کے علاوہ عام اردو داں کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کالم کو برابر جاری رکھیے۔ رؤف پاریکھ کا مضمون بے حد اہم ہے۔

''سنیما، ادب اور نصاب'' ''ترجمے کے بنیادی اصول و نظریات'' ''دانش گاہوں میں تحقیق: سمت و رفتار'' عمدہ اور معیاری مضامین ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید امتیاز الدین کا مضمون ''یادوں کے نگار خانے سے'' پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ بچوں کا گوشہ بھی معلوماتی ہے۔

■ **سمیں مکی، حکیم چک، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار۔824125**

جنوری 2007 کا شمارہ زیر نظر ہے۔ رؤف پاریکھ کی تحریر ''رومن اردو کیوں'' نہایت جامع ہے، اور اردو رسم الخط کے مخالفوں کے لیے مدلل جواب ہے۔ ''سنیما، ادب اور نصاب'' کے عنوان سے راحی معصوم رضا کا مضمون قارئین کے لیے ایک تحفہ ہے۔ دیگر مشمولہ مضامین بھی معلومات افزا ہیں۔

■ **ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار، بھیکن پور، 2، بھاگل پور (بہار)**

قومی اردو کونسل میں بحیثیت پرنسپل پبلی کیشن آفیسر پرویز شہریار کا آنا مبارک ہو۔

آپ نئی تابنا کی عطا کر سکیں گے۔ اس کا یقین ہے۔

سنا ہے، آپ میں رنگ، خوشبو، آواز اور روشنی کا امتزاج اسی لیے منفرد نظام کی توقع ہے۔

اردو کے وطن کا ہے شہر یار اک
اسی کی ذات سے قائم ہے اعتبار اک

امید ہے نغمہ بار ہوں گے۔

■ **ضیاء الرحمن غوثی، K-94، ابوالفضل انکلیو۔ا، نئی دہلی۔25**

پرویز شہریار کے اردو کونسل کا P.P.O. بن جانے کی خبر سن کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ بڑی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ اردو سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ بہر طور اس عہدۂ جلیلہ کے مستحق ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ۔

□□□

ہماری بات

موجودہ دور میں تعلیم انسان کی ایک انتہائی اہم بلکہ ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ملکوں میں عوام کے منتخب نمائندے حکومت کے کام کاج انجام دے رہے ہیں، بہ الفاظ دیگر بیشتر ملک ایسے ہیں جہاں جمہوری حکومتیں کارگزار ہیں۔ ہندوستان بھی انھی میں سے ایک ہے اور اسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا مرتبہ حاصل ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی جمہوری نظام حکومت کی کامیابی اور کامرانی ملک کے دیگر وسائل کے ساتھ ساتھ جن میں قدرتی وسائل بھی شامل ہیں، وہاں کے عوام کی بہتر شرح خواندگی پر منحصر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں شرح خواندگی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی بہ نسبت کم ہے۔ عوام کو خواندہ بنانے کے دستیاب وسائل کی کمی کے علاوہ ایک اور پہلو بھی ہماری توجہ چاہتا ہے۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود جہاں ہم ایک طرف دنیا کے بہترین انتظامی ماہرین، سائنس داں، ٹیکنالوجسٹ، ڈاکٹر، انجینئر اور بیوروکریٹ پیدا کر رہے ہیں، وہیں دوسری طرف ہم اپنی ان اخلاقی قدروں کو فراموش کرتے جارہے ہیں جو ہمارے تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی خاکوں میں معنویت کے رنگ بھرتی رہی ہیں، ایسے رنگ جو زندگی کو خوشگوار بھی بناتے ہیں اور خوبصورت بھی۔

تعلیمی نظام میں اخلاقی تربیت کے اصولوں کی عدم موجودگی نے ہماری نئی نسلوں پر بڑے منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ مادّی ترقی کی ایک اندھی دوڑ ہے جس میں آنکھیں بند کرکے ہم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جائز اور ناجائز یا مناسب اور نامناسب کا امتیاز اٹھتا جارہا ہے۔ استحقاق اور عدم استحقاق کے اصول بھی پیچھے جاپڑے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور زراندوزی کی ہوڑ لگی ہے۔ ہر شخص اجتماعی بہبود کی بجائے نجی مفاد پر نظر رکھتا ہے۔ انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ معلم اور استاد جو کبھی اس ملک کی روایات کے مطابق سماج کے لیے آدرش ہوا کرتے تھے، آج وہ طلب زر میں اپنے منصب و مقام کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔

اچھی تعلیم بنیادی طور پر انسان کو ایک اچھا انسان بناتی ہے اور بہتر زندگی گزارنے کے گر سکھاتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا عمل ہماری نوخیز نسلوں کے لیے ایک مسرت افزا اور فرحت بخش تجربہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنے بچوں کو ڈاکٹر اور انجینئر ضرور بنائیں لیکن انھیں معاشرے میں اچھے انسانوں کی طرح رہنا بھی سکھائیں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں کہیں نہ کہیں تو کوئی کمی رہ گئی ہے جو کبھی نوجوانوں میں منشیات کی لت کی شکل میں سامنے آتی ہے تو کبھی اسکول اور کالج کے احاطوں میں لڑکیوں میں ترغیب گناہ دینے والے ملبوسات کی صورت میں۔ یہ دراصل اخلاقی اصولوں سے بے پروائی اور مادّہ پرستانہ طرز زندگی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے بچوں سے توقعات تو بڑی بڑی وابستہ کر لیتے ہیں لیکن انھیں ان اصولوں سے آشنا نہیں کرتے جو انھیں اچھا انسان بنانے میں معاون ہوں۔ اخلاقی احساس سے عاری اولاد جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے تو بوڑھے والدین کو نوکروں کے حوالے کرکے مادّی آسائشوں کے حصول کے لیے ادھر ادھر نکل کھڑی ہوتی ہے۔ زیادہ تر نوجوان ان ملکوں کا رخ کرتے ہیں جہاں یہ آسائشیں ان کے لیے سہل الحصول ہوں۔ ہم اپنی نصابی کتابوں سے شرون کمار اور نصوح جیسے کرداروں کو خارج کرتے جارہے ہیں جو ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ بن کر ہمیں ایثار اور قربانی پر مائل کرتے تھے۔

آج ہمارا سماج متعدد خرابیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ دوسروں کو برداشت کرنے اور ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی خصلت مفقود ہوگئی ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون کا بل جمع کرانا ہو یا کوئی اور موقع، کوئی قطار میں کھڑے رہنا پسند نہیں کرتا۔ بسوں اور ٹرینوں میں ہمارے نوجوان اکثر بزرگوں، ضعیفوں، عورتوں بلکہ بچوں تک کی سہولت کی پروا نہیں کرتے۔ ضبط و تحمل کی خو سے اتنے بیگانہ ہو گئے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں۔ حادثات اور قدرتی آفات کے وقت لوگ زخمیوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ قانون شکنی کرنے والوں کو ٹوکنا یا ان کو روکنا تو درکنار۔

نوجوانوں میں راہ پانے والی غیر ذمہ داریوں اور بے راہ رویوں کا بروقت سدباب نہ کیا جائے اور ان کی ذہنی تربیت نہ کی جائے تو آگے چل کر یہی بظاہر معمولی نظر آنے والی باتیں بڑی بڑی غیر ذمہ داریوں اور کجرویوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور لاینحل سماجی مسائل پیدا کرتی ہیں۔

ان خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سارے کام حکومت اور اس کے انتظامی عملے پر چھوڑ دیے ہیں جب کہ ایک جمہوری معاشرے میں ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ سماجی بہتری کے کاموں میں شریک ہو۔ حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبے اسی لیے جگائے جاتے ہیں کہ ہم انسانی اخوت اور ہمدردی اور اخلاقی قدروں کی میراث کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنی نئی نسل تک منتقل کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم اپنی تہذیبی اقدار کی بھی حفاظت کریں۔ ورنہ معاشرتی آداب اور سماجی رشتوں کے انتشار کے جس عذاب سے آج مغرب دوچار ہے، کل ہمیں بھی اس کا سامنا ہو سکتا ہے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس کالم میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔
ادارہ

سوال: ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ "ساٹھ برس کے بعد زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے" ("آب حیات"، ص124، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ)۔ تو پھر ہم اردو زبان کو قدامت سے کیوں جوڑتے ہیں اور اس کے الفاظ کے سند کے لیے قدیم شعرا کا کلام کیوں پیش کرتے ہیں؟

جواب: یہ قول "ہمارے زبان دانوں" کا نہیں، صرف محمد حسین آزاد کا ہے اور بے بنیاد ہے۔ زبانوں میں واضح فرق پیدا ہونے کے لیے دس سال بھی بہت ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ سو سال میں بھی کوئی "واضح فرق" نہ پیدا ہو۔ اردو ان زبانوں میں ہے جن میں تبدیلی کی رفتار بہت سست رہی ہے اور آج بھی یہ بہت تیز نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اردو میں الفاظ اور محاورات وغیرہ کے معنی یا استعمال کی سند کے لیے صرف شعرا کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ نثر سے بھی شواہد لائے جاتے ہیں یا لغت کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ جس مصنف یا لغت سے ہم سند لا رہے ہیں اسے عام طور پر معتبر مانا جاتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ سند ہمیشہ کسی خاص معنی یا استعمال کو ثابت کرنے کے لیے لائی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر معنی یا استعمال کو ثابت کرنے کے لیے کسی نہ کسی شاعر یا نثر نگار کی سند ضروری ہو۔ مثلاً "کتاب" کے معنی وہی ہیں جو انگریزی میں Book کے ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت کرنا ہو کہ "کتاب" کو "قرآن"، یا "کتاب الٰہی" کے بھی معنی میں برتا گیا ہے تو ہم میر کے اس شعر سے سند لائیں گے (دیوان پنجم):

ایک طرف جبریل آتا ہے ایک طرف لاتا ہے کتاب
ایک طرف پنہاں ہے دلوں میں ایک طرف پیدا ہے عشق

اس سند کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بھی "کتاب" کو "قرآن یا کتاب الٰہی" کے معنی میں ضرور استعمال کریں۔ اس سند کا مطلب صرف اتنا ہے کہ "کتاب" کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ معنی اب رائج نہیں۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ میر نے لکھا ہے اس لیے ہم بھی لکھ سکتے ہیں۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس سند کے اعتبار سے "کتاب" کو "وید، یا گیتا" کے معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب باتیں صحیح ہوں گی۔ معتبر مصنف یا لغت کی سند لانے کا یہی فائدہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ آپ نے "سند" کو مذکر لکھا ہے۔ یہ لفظ مونث ہے اور اسے مونث ثابت کرنے کے لیے کسی معتبر لغت یا مصنف ہی کی سند لانی ہوگی۔

ایک بات یہ بھی کہنے کی ہے کہ "ہم اردو زبان کو قدامت سے کیوں جوڑتے ہیں" اردو کا روزمرہ یا محاورہ نہیں۔ آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "اردو زبان کے بارے میں باتیں قدامت پرستی پر مبنی کیوں ہیں؟"

سوال: کوہ کندن وکاہ برآوردن کا معنی کیا ہے؟

جواب: اس کا اردو مترادف ہے "کھودا پہاڑ [اور] نکلی چوہیا"۔ فارسی کہاوت کے لفظی معنی ہیں: پہاڑ کھود ڈالنا اور [پھر اس میں سے صرف] گھاس برآمد کرنا۔
براہ کرم ملحوظ رکھیں کہ اردو میں "معنی" کو عام طور پر جمع بولتے ہیں چاہے واحد ہی مراد لیں۔

سوال: اردو میں ون کو بن، یمنا کو جمنا، اور ورشا کو برکھا کیوں بولا جاتا ہے، جب کہ شعور کو سہور، تتمہ کو طمطمہ اور مزدور کو مجور کیوں نہیں بولا اور لکھا جاتا ہے؟

جواب: زبانیں جب لفظ بناتی ہیں یا غیر جگہ سے کسی لفظ کو لاتی ہیں تو وہ اس معاملے میں خود مختار ہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ زبان وہی لفظ بناتی ہے جو اس کے یہاں بن سکتا ہو۔ اور زبان

جب باہر سے کوئی لفظ لیتی ہے تو اسے اپنے مطابق بنالیتی ہے۔ لیکن اس قاعدے کے مستثنیات بھی ہیں۔ لہٰذا کوئی مجموعی حکم نہیں لگ سکتا۔

مثلاً آپ پوچھتے ہیں کہ ''تتمہ'' کو ''طمطہ'' اور ''شعور'' کو ''سہور'' کیوں نہیں کرلیا گیا؟ وجہ ظاہر ہے کہ اردو میں تائے فوقانی (ت) موجود ہے۔ اس لیے تائے فوقانی (ت) کی آواز بدلنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یعنی تائے فوقانی (ت) کوٹ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عربی میں چونکہ ٹ نہیں ہے، اس لیے اگر لفظ ''طمطہ'' وہاں لیا جاتا تو بے شک ''تتمہ'' کی شکل میں آتا۔ اسی طرح، اردو میں شین بھی موجود ہے، اس لیے ''شعور'' کی شین کو بدلنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن چونکہ اردو میں عین (حرف) تو ہے لیکن اردو والے اس کی آواز کو عربی کی طرح نہیں بولتے بلکہ عام طور پر الف کی طرح بولتے ہیں۔ اس لیے وہ ''شعور'' کو یوں بولتے ہیں گویا وہ ش + اُو + ر ہو۔ عین کی آواز کو بائے ہوز میں بدلنے کا کوئی رواج اردو میں نہیں اس لیے اردو میں ش + اُو + ر رائج ہوا، ش + ہُو + ر نہیں۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ اصل عربی لفظ ش + عُو + ر ہے لیکن اردو والے عام طور پر شین پر زبر لگاتے ہیں۔ کیوں لگاتے ہیں؟ بس اس لیے کہ اب یہ لفظ ہمارا ہے، ہم اسے یوں ہی بولیں گے۔

''مزدور'' کو پہلے زمانے میں ''مزور'' (یعنی دال مہملہ کے بغیر) بھی بولتے اور لکھتے تھے۔ اسی طرح، ''مزدوری'' کو ''مزوری'' بھی لکھتے اور بولتے تھے۔ یہ الفاظ Platts کے لغت میں موجود ہیں۔ بعد والوں نے دال کو ساقط کرنا ترک کر دیا۔ اور ''مجور'' نہ بولنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ جب زبان میں زے کی آواز موجود ہے تو اس کو بلا وجہ جیم سے بدلنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ فارسی میں یہ لفظ مع اول مضموم یعنی ''مُز دور'' بروزن ''پرنور'' ہے۔ لیکن اردو والوں نے فارسی تلفظ چھوڑ کر میم پر زبر لگالیا۔ کیوں لگالیا؟ اس کا جواب بس یہ ہے کہ ہماری مرضی، یہ لفظ ہمارا ہو گیا ہے، ہم اسے یوں ہی بولیں گے۔

شعور اور مزدور مع اول مضموم سے مع اول مفتوح کیوں ہو گئے، اس کا کوئی جواب نہیں۔ اسی طرح، اس بات کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ واؤ اور ی کی آوازیں موجود ہوتے ہوئے بھی اردو والوں نے ون، یمنا، ورشا کو بن، جمنا، برکھا کیوں کرلیا؟ خیر برکھا میں ''کھا'' کے لیے تو جواب ہے کہ سنسکرت ''ورشا'' میں خالص شین نہیں، بلکہ کچھ کھہ سے ملتی ہوئی آواز ہے۔ لیکن سنسکرت و اور ی کو بائے فوقانی (ب) کیوں بنالیا، اس کا کچھ جواب نہیں۔ لیکن یہی نہیں، سنسکرت ش کو بھی اردو نے اکثر سین سے بدل لیا ہے، حالانکہ شین کو شین پڑھنا اردو والے کی پہچان میں شامل ہے۔ لیکن اردو نے دیش کو دیس، ویش کو بھیس بنا دیا۔ پھر نہ جانے کس دھن میں فرانسیسی کارتوش Cartouche کو بھی کارتوس کر دیا۔ پہلے زمانے میں انگریزی لفظ پنشن (Pension) کو بھی ''پنسن'' لکھتے اور بولتے تھے۔ غالب نے جگہ جگہ 'پنسن'' لکھا ہے۔

یہ اردو ہی کی تخصیص نہیں، تمام زبانوں میں اس طرح کی عجیب اور دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ یہ بھی زبان کے مزوں میں سے ایک مزا ہے کہ child کی جمع childs نہیں بلکہ children ہے اور ox کی جمع oxs یا oxes نہیں بلکہ oxen ہے اور cow کی ایک جمع kine بھی تھی۔ night کا تلفظ نائٹ ہے تو indict کا بھی تلفظ انڈائٹ ہے۔ اول الذکر اینگلوسیکسن لفظ ہے اور موخرالذکر لاطینی سے آیا ہے۔ لاطینی والے لفظ میں C کا تلفظ کاف تھا، اور night کا تلفظ پہلے زمانے میں یوں تھا گویا night میں gh نہیں بلکہ k ہے، یعنی night کو nikt کی طرح بولتے تھے۔ زبان ایک خودمختار اور بڑی حد تک بے اصول نظام ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ زبان میں قیاس نہیں چلتا، رواج عام جو کہے وہی سند ہے اور رواج عام کسی قاعدے کا پابند نہیں ہوتا۔

(سوالات از نجمے کمار، الہٰ آباد، (یو۔ پی۔))

□□□

پتہ:
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

''اردو دنیا'' کے قارئین میں اس کالم کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ حال ہی میں بعض سوالات ایسے ارسال کیے گئے ہیں جن کا تعلق محض عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی سے ہے۔ اگرچہ ان سبھی سوالات کے جوابات محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کی جانب سے دیے جا رہے ہیں لیکن آئندہ سوالات کرتے وقت یہ خیال رہے کہ ارسال کردہ جملہ سوالات کا تعلق صرف اردو زبان اور اس کے روز مرہ سے ہو۔

سوالات ارسال کرنے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ مکمل پتہ بھی ارسال کریں۔

(ادارہ)

عبدالستار دلوی

جدید تعلیم

(عصری ضرورتیں اور اردو)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پہلے ہماری تعلیم پاٹھ شالاؤں، پنڈتوں اور پروہتوں اور اسی طرح مسجدوں مدرسوں، مکتبوں اور خانقاہوں سے وابستہ رہی ہے جس میں روایتی مضامین جیسے زبان، قواعد، شاعری، قرآن و حدیث، فلسفہ ومنطق اور دھرم اور شاشتر وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں حکمرانوں کی رہنمائی کے لیے سیاسی موضوعات اور حکمرانی کے قواعد وضوابط پر بھی کتابیں لکھی گئیں۔ کوٹلیہ کی ''ارتھ شاستر'' اور نظام الملک طوسی کا ''سیاست نامہ'' وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں جو خاموشی سے ہمارے نظام تعلیم کا حصہ بنتے گئے۔ اس روایتی تعلیم کو انگریزوں کے عہد میں وسعت حاصل ہوئی اور نظام تعلیم کو پاٹھ شالاؤں، مدرسوں اور خانقاہوں سے نکل کر نئی سمت اور رفتار حاصل ہوئی۔

زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ سماجی انقلابات کا آنا فطری بات ہے اور علمی افق کے ستاروں کا طلوع ہونا بھی تعجب خیز نہیں ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی میں مختلف النوع تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں، انسانی ضروریات میں نئے زمانے کے ساتھ ساتھ اضافے ہوتے رہے۔ ہم کیپٹلزم اور کمیونزم سے ہوتے ہوئے ''سیاست'' اور معاشی برتری کے زمانے میں داخل ہوتے تو اس میں سائنس کو برتری حاصل ہوتی اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے نئی ضروریات اور نئی ضروریات کے ساتھ نئی تعلیم کا احساس بھی جگایا۔ ہم تعلیمی لحاظ سے اب جس دور میں داخل ہوئے ہیں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے جس نے نہ صرف دیہاتوں کو شہروں سے قریب کر دیا ہے بلکہ مشرق ومغرب میں ایک علمی وفکری مماثلت اور ہم آہنگی بھی پیدا کر دی ہے۔ نئے سائنسی علوم کا حاصل کرنا ترقی کے لیے بہت ضروری ہے، ہر ملک کی اپنی تاریخی وتہذیبی شناخت ہوتی ہے۔ اور اسے قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی تاریخ، تہذیب اور لسانی شناخت ازبس ضروری ہے، لہٰذا ہماری تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماجی علوم، ادب اور شاعری اور سائنس میں ایک توازن قائم کرے۔ ہماری زندگی میں مبالغے کی حد تک سائنس کا عمل دخل ہمیں اپنی تاریخ اور تہذیب سے دور کر دے گا، اس لیے ضروری ہے کہ ہم صرف مشین نہ بنیں اور صرف معاشی ترقی کو اپنے آپ پر حاوی نہ ہونے دیں بلکہ سائنس اور سماجی علوم کے خوشگوار امتزاج سے اپنے معاشرے کی تعمیر کریں۔

ہمارے معاشرے کا عام رجحان سائنس کی تعلیم کی طرف ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں یا انجینئر۔ جن طلبہ کا فطری رجحان ان مضامین میں تعلیم حاصل کرنے کا ہو انھیں یقیناً ڈاکٹری، انجینئرنگ، کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے، لیکن ایسے طلبہ کی بھی ایک اچھی تعداد ہونی چاہیے جو سماجی علوم اور ادب کی تعلیم حاصل کریں۔ ہمیں جہاں ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت ہے وہیں تاریخ، سماجیات، معاشیات، سیاست اور دیگر سماجی علوم میں ماہرین کی بھی ضرورت ہے۔ سماجی علوم کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے اس کی اہمیت کا احساس ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ ان علوم کے حصول میں مالی منفعت سائنسی علوم کے مقابلے میں کم ہو، لیکن ہمارا مقصد صرف مالی منفعت ہی نہیں ہونا چاہیے جو آج ہماری تعلیمی زندگی کا عام رجحان بنتا جارہا ہے۔ ہمیں سماجی علوم اور کلاسیکی زبانوں نیز جدید زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی میں سماجی علوم اور کلاسیکی نیز جدید ہندوستانی زبانوں اور اسی کے ساتھ جدید یورپی زبانوں مثلاً انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں اعلیٰ لیاقت پیدا کی جاتی تھی۔ لیکن تاریخ، سماجیات، فلسفہ ومنطق کی تعلیم بھی دی جاتی تھی جس کی وجہ سے تعلیم میں یک رخاپن نہیں تھا۔ طلبہ اپنے وسیع تر مطالعے کے ساتھ اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرنے کی صلاحیتیں بھی رکھتے تھے۔ میرے خیال میں سائنس کے طالب علم کے لیے سماجی علوم اور ادبیات سے دلچسپی رکھنا ضروری ہے، اسی طرح آرٹس کے طالب علم کے لیے سائنس کی مبادیات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے تعلیم کی ضرورت واہمیت کا ان میں احساس پیدا ہو گیا ہے لیکن اب بھی وہ بہت پیچھے ہیں۔ یہ حالات موجودہ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو اکثریت کے مقابلے میں زیادہ محنت کرنی ہوگی اور بزور علم زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا'' رہنا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ گذشتہ چند برسوں میں علم کی جو پیاس بڑھی ہے اور آگے

بڑھنے کا جو جذبہ پیدا ہوا ہے اسے بھی یک رخا نہیں رہنا ہے۔ سائنسی تعلیم کے ساتھ دوسری دنیاؤں کی تلاش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر اور انجینئر کے ساتھ ہمیں اپنے بچوں کو انتظامیہ کے لیے تیار کرنا چاہیے، اس سے اعلیٰ ملازمتوں کے ساتھ خدمت خلق کے وسیع تر امکانات ہیں۔ اردو، فارسی اور عربی کے اعلیٰ سند یافتہ طلبہ اپنے وسیع تر مطالعے کے ساتھ اپنے آپ کو I.A.S. اور اسی نوع کی دیگر ملازمتوں کے لیے تیار کریں تو ان کا مستقبل تابناک ہو سکے گا۔

عہد حاضر کا نظام تعلیم کسی ایک مذہبی فرقے یا ذات کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ سب کی تعلیم اور ذہنی تربیت کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم سے ثانوی تعلیم اور ثانوی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک سبھی کے لیے اس کا فیض جاری ہے، لیکن ملک کے مخصوص سیاسی اور سماجی ماحول میں نظام تعلیم کے پس منظر اور اقلیتوں کو پیش آنے والے مسائل کی روشنی میں ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ضروری ہے۔ ایک طویل عرصے تک ثانوی اور اعلیٰ نظام سے محرومی کی وجہ سے اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مذہبی اور لسانی شناخت کی حفاظت کے پیش نظر زبانوں کی اہمیت اور تاریخی تشخص کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ان میں سائنسی فکر کی نشو ونما بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا اور منصوبہ بند طریقے سے طلبہ کی لیاقت کو وسعت دے کر، انھیں زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ سائنس، آرٹس اور کامرس میں توازن پیدا کرنے سے ہم بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی تعلیم کا بنیادی مقصد شخصیت سازی ہے۔ آج کے مشینی دور میں تعلیم کو شخصیت سازی سے زیادہ معاشی سربلندی اور مال و متاع کے حصول کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ حصول معاش تعلیم کا ایک قانونی پہلو ہے۔ تعلیم سے حصول معاش میں مدد لی جا سکتی ہے، لیکن یہ اصل مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ قدیم و جدید کی جس کشمکش سے آج ہم دوچار ہیں اس میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا ضروری ہے۔

تعلیم میں شخصیت سازی کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ شخصیت سازی فلسفۂ تعلیم میں بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر شخصیت سازی نہ ہو تو حصول علم کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ تعلیم میں مدرسے اور یونیورسٹی کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن اولین منزل ماں کی آغوش، گھر کا ماحول، پاس پڑوس اور سماجی زندگی ہے، جو بچے کو متاثر کرتی ہے۔ شخصیت سازی میں تعلیم تو اپنا کردار ادا کرتی ہی ہے لیکن تربیت تعلیم سے کم اہم نہیں ہے۔ تعلیم اور تربیت دونوں پر بچے کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لہٰذا تعلیم اور تربیت دونوں ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ہم نے نظر انداز کیا تو اس کے نتائج فرد اور سماج دونوں کے لیے مضر ثابت ہوں گے۔ شخصیت کی تعمیر میں گھریلو ماحول اور سماج کے بعد تعلیم گاہوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ طالب علم میں اس کے مقصد کے تعین کو بنیادی حیثیت دینی ہوگی۔ اگر طالب علم کی زندگی اور تعلیم کا کوئی مقصد معین نہ ہو تو اپنی ساری قابلیت اور مطالعے کے باوجود وہ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہ جاتا، لہٰذا ضروری ہے کہ گھر اور اگر گھر نہیں تو مدرسہ بشمول کالج اور یونیورسٹی اس کے ذوق و شوق کی روشنی میں مقصد کے حصول کے لیے اس کی ذہن سازی کریں۔ مقصد سے لگاؤ اور اس کے حصول کی جد و جہد، اس کی شخصیت کو روشن کر دینے میں معاون ثابت ہوگی۔

روپیہ پیسہ کمانا زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے لیکن روپیہ پیسہ کمانے کے ہنر سے واقفیت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ روپیہ پیسہ کمانا بہت کچھ ہے، لیکن سب کچھ نہیں ہے۔ باعزت زندگی گزارنے کے لیے دیگر صلاحیتوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً مقصد کی لگن کے ساتھ طالب علم میں رہنمایانہ یا قائدانہ صلاحیتوں کی موجودگی وغیرہ۔

شخصیت کی تعمیر کا دوسرا اہم پہلو طالب علم میں خود آگہی کی صلاحیت بڑھانا ہے۔ جب طالب علم اپنی پسند و ناپسند کا اندازہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو اس کی شخصیت کی تعمیر کی راہیں کھل جاتی ہیں، اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ ہر بچے میں کچھ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، اس کے اپنے خلقی رجحانات ہوتے ہیں اور انھی صلاحیتوں اور رجحانات کی آگہی سے وہ اپنے مقصد زندگی کا تعین کر سکتا ہے۔ ابتدائے تعلیم سے ہی اس کی ابلاغ و ترسیل کی صلاحیتوں کو وسعت اور رفتار دینا بھی ضروری ہے۔ ابلاغ و ترسیل کی صلاحیت اس کی کامیاب زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ بچہ قابل ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کی قوت اظہار کمزور ہو، جذبات اور خیالات کی پیش کش میں وہ کمزور ہو تو تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اس کی شخصیت نشو و نما نہیں پا سکتی۔ ابلاغ و ترسیل کے لیے زبان اور تقریر و تحریر کی صلاحیتیں اس کا ہتھیار ہوتی ہیں۔ زبانیں تقریر اور تحریر کا وسیلہ ہیں۔ اچھی گفتگو کی صلاحیت سے شخصیت پر نکھار آ جاتا ہے اور گفتگو میں اگر صداقت ہو، خلوص کی آنچ ہو تو وہ سامع کو متاثر کرتی ہے۔ یہی صورت اچھی تحریر کی بھی ہوتی ہے۔

تقریر اور تحریر کا رشتہ تحریری اور تقریری مقابلوں کے ساتھ طلبہ کے آپسی تال میل، بحث و مباحثے یا انھیں جماعتوں اور ٹولیوں میں تقسیم کر کے بحث و مباحثے کی تربیت سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کسی زمانے میں ''خوشخطی'' ہمارے نصاب کا حصہ ہوا کرتی تھی اور تحریر کی خوشنمائی طالب علم کی شخصیت کو ابھارتی تھی۔ سبھی زبانوں میں تحریر کا حسن موجود ہے، لیکن اردو رسم خط یا طرز تحریر میں خوشخطی ایک فن ہے۔

تعلیم کا بنیادی مقصد شخصیت کی تعمیر ہے اور شخصیت کی تعمیر کا اہم ترین پہلو اخلاق سازی ہے۔ طلبہ کو اخلاقی نکات سے واقف کرانا بھی معلم کی ذمے داری ہے۔ سچ بولنا، سماج کے لیے کام آنا، ایماندارانہ زندگی گزارنا، ہمدردی سے پیش آنا اور دوسری اعلیٰ اقدار سے آگاہ کرانا، شخصیت سازی کے لیے ضروری ہے جن کے بغیر تعلیم تعلیم نہیں رہتی بلکہ تجارت بن جاتی ہے۔ مذکورہ اخلاقی اقدار پیدا کرنے کے لیے طلبہ کے لیے ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تاہم ان امور کے حصول میں ادب اور شاعری سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی نظمیں، اقبال کی نظمیں اور شفیع الدین نیّر کی شاعری، جہاں ایک طرف اخلاقی اقدار کا درس دیتی ہے وہیں وہ جمالیاتی حس کو بھی بیدار کرتی ہے۔ اردو میں ابتدائی تعلیم میں مذکورہ شعرا کے ادب پاروں سے اخلاق سازی میں مدد لی جا سکتی ہے۔

موجودہ دور میں جہاں کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا چرچا ہے اور تعلیم سے زیادہ تجارت کا رجحان غالب ہے۔ ادب، شاعری اور سماجی علوم کی بات شاید کچھ لوگوں کو بے وقت کی راگنی لگے لیکن سائنسی علوم کا پرزور خیر مقدم کرنے کے باوجود ادب اور شاعری اور سماجی علوم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا سکتا۔ کسی بھی ملک کی تہذیبی زندگی، ادب اور سماجی علوم کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہے اور یہ علوم جنھیں عرف عام میں ''انسانیاتی سائنس'' کہا جاتا ہے، تہذیبی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے کی برکت یہ ہے کہ آدمی مشین نہیں بنتا سائنس کے طالب علموں کے لیے بھی یہ ذہنی توانائی کا باعث بنتے ہیں۔ مشہور سائنس داں ڈارون جب مطالعے سے فارغ ہوتا تھا تو فرحت و انبساط کے لیے شاعری سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ادب و شاعری اور سماجی علوم، تہذیب و ثقافت سے انسان کا رشتہ جوڑتے ہیں مزید برآں شخصیتوں کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

□□□

پتہ:
3, Al-Hilal
Bandra Complex
Mumbai-400050

دل کی گیتا

مؤلف: محمود سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نو آموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو و نما پا کر ابھر سکیں، ان کی فطری نشو و نما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

یونانی ادویہ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی

طب یونانی میں دو طرح کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں، مفرد اور مرکب۔ اگر طبیب مرض کی علامات کی بہتر تشخیص کرلے تو مفرد ادویہ کے ذریعے بڑی آسانی سے علاج کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیموں نے مرکبات کی بجائے مفردات کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس کتاب میں 334 ادویہ کی تفصیل درج کی گئی ہے جس میں مختلف نو کیمیات اور میوہ جات سے لے کر انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے بھی شامل ہیں۔

صفحات: 365، قیمت -/70 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

خواجہ اکرام

سائبر اسپیس اور اردو زبان کی تدریس

صارفیت کے اس دور میں دنیا نہ صرف کثیر لسانی ہوتی جارہی ہے بلکہ علاقائی زبانوں کی اہمیت بھی بڑھ رہی ہے اور اردو کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے کسی علاقے سے جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ برصغیر کی وادیوں سے نکل کر سمندر کے دوسرے کناروں پر بسے ممالک میں بھی اس زبان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تقریباً تمام براعظموں میں اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رسم خط جاننے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اردو کے اہل نظر اور صاحب بصیرت ادیبوں اور مفکروں نے ایسے لوگوں کے لیے جو اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے مگر سمجھ اور بول سکتے ہیں، جن کا ذہنی معیار بہت بلند ہوتا ہے اور ان میں قوت اخذ بھی زیادہ ہوتی ہے، ان کے لیے جدید سائنسی اصولوں کے تحت بیش قیمت کتابیں لکھی ہیں۔ البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ وقت اور تقاضے کو ملحوظ رکھ کر نئی کتابیں مرتب کی جائیں۔ جو جدید تعلیمی وسائل سے ہم آہنگ ہوں۔

کمپیوٹر کے Key Board پر انگشت رکھ کر دنیا اور دنیا کے تمام علوم و فنون اور ممکنہ معلومات آپ گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی سائبر اسپیس ہے۔ سائبر اسپیس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

"Cyberspace" is a term coined by a science fiction writer to describe the place where data is stored, transformed and communicated. Its meaning has broadened to include the fullarray of computer-mediated communications andinteractions."

سائبر اسپیس اس عہد کا وہ خزانہ ہے جہاں علوم وفنون اور معلومات کا ذخیرہ پنہاں ہے۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے ہم آہنگی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہم نے سائبر اسپیس کے امکانات کو خاطر میں نہیں لایا اسی لیے اردو تدریس کے حوالے سے جب کسی ایسے ویب سائٹ کی تلاش کرتے ہیں جو اردو زبان سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں پورے طور پر معاون ہو تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ میں ان ویب سائٹس کی بات کر رہا ہوں جن کا Free access ہے البتہ کئی Paid sites ضرور موجود ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ حروف تہجی کی شناخت، لفظوں اور جملوں کی ساخت، قواعد اور فرہنگ کو انھوں نے مہیا کرایا ہے۔ مگر میں نے ان سائٹس کو اس مطالعے میں شامل نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے نام پر دنیا بھر میں کئی ایسے ادارے موجود ہیں جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس سمت میں کام کر رہے ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان میں قومی سطح کے مختلف ادارے ہیں اور صوبائی سطح پر مختلف اردو اکیڈمیاں موجود ہیں مگر انھوں نے اس سمت میں کوئی کوشش نہیں کی۔ ان اداروں کے ویب سائٹس تو موجود ہیں مگر اکثر تو ایسے ہیں جو مہینوں تک Update نہیں ہوتے۔ پاکستان میں اس سمت میں قابل قدر کوششیں ہوئی ہیں اور کئی ایسے سائٹس ہیں جو اردو سکھانے میں ابتدائی سطح پر معاون ہیں، لیکن یہ بھی بہت دور تک طالب علموں کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ محض چند اسباق اور حروف تہجی کی شناخت تک محدود ہیں۔

بی. بی. سی. کا خود مختار ادارہ جو خبر رسانی کے سبب پوری دنیا میں اپنی شناخت اور اہمیت رکھتا ہے، اس کے سائٹس پر بھی Urdu learning کی سہولت موجود ہے لیکن یہاں بھی روزمرہ ضرورتوں کے مدنظر محدود مکالمے اور حروف تہجی کی شناخت کے سوا اگر کچھ ہے تو Link sites ہیں۔ لیکن ان سائٹس پر تجزیاتی گفتگو سے قبل بی. بی. سی. کے Home Page پر جو چند جملے اردو زبان کے حوالے سے لکھے گئے ہیں ان پر غور وخوض کرنا زیادہ مناسب ہے مثلاً:

Why learn Urdu?

1. It is a living language spoken 190 million.
2. The urdu community in the UK numbers about one million speakers.
3. It is not just a practical language spoken on a daily basis, but one that produced great scholarships and poetry.

(www.bbc.uk/urdu)

پہلے جملے میں بی. بی. سی. نے جو اعداد وشمار دیے ہیں، وہ قابل غور ہیں کیونکہ ہر طرف اور کم از کم ہندوستان میں بار بار یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو زبان ختم ہو رہی ہے اور اس کا مستقبل تاریک ہے۔ زبان کے زندہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بولنے والے کتنے ہیں۔ ہم اردو بولنے والے جب بھی اعداد وشمار کی بات کرتے ہیں تب یا تو سرحدوں کی لکیروں میں

کھو جاتے ہیں یا اپنے ملک سے محدود رواج اور حکومت کے بے بنیاد اعداد و شمار پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ایک تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دنیا میں انگریزی کے بعد جس زبان نے وسیع علاقوں میں ہجرت کی ہے وہ اردو ہے۔ یعنی عالمی سطح پر انگریزی کے بعد اردو کو اس اعتبار سے دوسرا مقام حاصل ہے۔ اب ہماری توجہ اس بات پر ہونی چاہیے کہ بی۔بی۔سی۔ کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد اگر 490 ملین ہے تو اس میں سے ایک ڈیڑھ سو ملین ایسے ضرور ہوں گے جو رسم خط سے واقف نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہندوستان میں اور مغربی اور یوروپی ممالک میں زیادہ ہے۔ پاکستان کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ لیکن مغربی اور یوروپی ممالک میں نئی نسل کی ایک بڑی تعداد ہے جو اردو تو بولتی ہے مگر پڑھ لکھ نہیں سکتی۔ یہ طبقہ جدید طرز تعلیم سے ہم آہنگ ہے۔ معمولی معلومات کے لیے بھی نئی نسل کے بچے انٹرنیٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ انٹرنیٹ ان کے تدریسی نظام کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ اس صورت حال کو ذہن میں رکھیں اور سائبر اسپیس کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اتنی بڑی آبادی کے لیے انٹرنیٹ پر اردو Learning کے لیے عربی و فارسی Learning سائٹس کے مقابلے کا بھی کوئی سائٹ موجود نہیں ہے۔ Google search کے ذریعے جتنے سائٹ ہمیں ملے ہیں انھی بنیادوں پر میں یہ بات کہہ رہا ہوں اور ان کی فہرست طویل ہے مگر زیادہ تر سائٹس Similar ہیں، Link Sites ہیں۔ Google search میں جب آپ جائیں گے تو حیرت انگیز طور پر اکتالیس لاکھ سائٹ ملیں گے۔ ان تمام سائٹس کو ایک ایک کر کے دیکھنا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن TRP میں جو سائٹس اچھے ہیں۔ انھی کو بنیاد بنا کر ہم نے یہ مطالعہ کیا ہے اور Randomly بعض ایسے سائٹس بھی دیکھے ہیں جو Rating میں بہت نیچے ہیں۔

bbc.co.uk/languages/other/guide/urdu: اس سائٹ پر حروف تہجی Audio support اور رومن اسکرپٹ کے ذریعے درج کیا گیا ہے۔ لیکن صرف مفرد حروف کو بتایا گیا، مرکب حروف کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کے بعد Listen & Learn : Urdu Key Phrases کے تحت روزمرہ ضرورت میں پیش آنے والے جملے درج ہیں ان جملوں کو رومن رسم خط میں لکھنے کے ساتھ ان کا انگریزی میں متبادل بھی درج کیا گیا ہے جو اس طرح ہے:

Urdu Phrase	Pronunciation	Meaning
السلام علیکم	Assalam-o-Alekum	Hellow

usersskynet.be: یہ ایک (Tri Lingual) سائٹ ہے جو Self learning اصول کے تحت Develop کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے حروف تہجی درج ہیں۔ حروف کی مختلف شکلوں کو Final, Medial, Initial اور Detached کی درجہ بندی کرتے ہوئے وضاحت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعد ازاں الگ الگ حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے اور تلفظ کو ہندی، انگلش میں بھی بتایا گیا ہے۔ اس سائٹ کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ کسی لفظ پر کرسر رکھیں تو وہ جملہ انگلش میں نظر آئے گا اور کرسر ہٹالیں تو اردو اور ہندی میں نظر آئے گا۔ اس کے بعد long vowel، short vowel اور Special sign جیسے جزم، ساکن، ہمزہ وغیرہ کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختلف اسباق بھی دیے گئے ہیں۔ پہلے سبق میں چار خانوں کے تحت جملے بنانے کی ترکیب اور اس کا مفہوم انگلش میں دیا گیا ہے جسے سن کر بھی سمجھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ جملے بنانے کی ترکیب ایسی ہے جو غیر اردوداں کے لیے بھی مفید ہے۔ سائٹ کی تیاری میں جدید تکنیک کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے کہ تمام جملے اردو میں لکھے گئے ہیں لیکن جب کسی جملے پر کرسر رکھتے ہیں تو وہاں رومن اسکرپٹ میں وہی جملہ نظر آتا ہے اور اس کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جملے کی ساخت میں اسماء، افعال اور ضمائر کا استعمال آسانی سے سمجھ میں آجائے مثلاً:

آداب عرض جناب — Greeting Sir!

میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں — I/University/in/Professor/am

I am Professor in the University

باقی اسباق ابھی تیاری کے مراحل میں ہیں 24 اگست 2006 کی شام تک Lesson کے صفحے پر Under construction آرہا تھا۔ اگر یہ سائٹ اسی Sprit کے ساتھ Upload ہوگیا تو یہ بہت بہتر سائٹ ہوگا۔

ukindia.com: اس سائٹ میں پینٹ برش کی مدد سے حروف جس طرح لکھے گئے ہیں وہ ذوق جمال کو مجروح کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حروف میں یکسانیت نہیں آپائی ہے۔ اعراب کا اہتمام اور مختلف حروف سے لفظوں کی ساخت کو بہتر طور پر نہیں سمجھایا گیا ہے اور نہ ہی Audio support کے ذریعے ان آوازوں سے آشنا کرانے کا اہتمام ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ لفظوں کے لکھنے میں بھی غلطیاں راہ پاگئی ہیں۔ مثلاً فیئر کو فر لکھا گیا ہے۔ اس میں شوشہ غائب ہے اور ہاف کو شوشہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے مگر ایسی کئی غلطیاں موجود ہیں۔ اسی طرح تحریر میں حروف کی Placing کا بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اور جہاں بڑے جملے لکھے گئے ہیں وہاں رومن حروف کو بھی اُلٹا لکھا گیا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیں:

اون	وڈیو	د	سوچ	وگی
n.o	o.y.d.io	the	ch.i.v.s	i.k.k.i.v

یہاں جو متبادل دیے گئے ہیں وہ کیسے ان حروف کی ادائیگی کر سکتے ہیں؟ بہرکیف یہ ایک کوشش تو ضرور ہے مگر کیا ایسی کوششیں مثبت ہیں؟ بہرکیف یہ سائٹ کئی اسباق پر مشتمل ہے جن کو Zippied format کے تحت رکھا گیا ہے۔

pakdata.com: یہ سائٹ اس اعتبار سے بہت بہتر ہے کہ اس میں نستعلیق کا استعمال ہوا ہے۔ نستعلیق کا فونٹ کمپیوٹر کی اردو تحریر کے لیے سب سے دلکش ہے۔ pakdata کے Service provider حالانکہ اردو نستعلیق اور اردو سافٹ ویئر میں Poineer ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے پاس یہ صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ بہتر سے بہتر اردو Learning سائٹ بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے جو Accessable link رکھا ہے وہ بہت جدید طرز اور پرکشش نستعلیق رسم خط میں موجود ہے۔ تمام حروف تہجی کو خوبصورت اور مزین طریقہ سے Home page پر رکھا گیا ہے کسی بھی حرف پر کلک کرنے سے وہ حرف کئی طرح سے لکھا جاتا ہے وہ بلیک بورڈ پر عملی شکل میں لکھتے ہوئے دکھائی دے گا۔ اس عمل سے نوآموز کو آسانی ہوتی ہے وہ حروف کو لکھنے کے صحیح طریقے سے واقف بھی ہو جاتا ہے۔ اور اسی صفحے پر دوسری جانب تصویر کی مدد سے لفظ اور معنی کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے آگے Free access اسباق نہیں ہیں۔ البتہ ان کے سائٹ پر قواعد اور لغت کے سافٹ ورژن موجود ہیں جنھیں خرید کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

www.languageshome.com: یہ سائٹ مختلف زبانوں کے حوالے سے بنایا گیا۔ اس سائٹ میں کئی ہندوستانی زبانیں شامل ہیں۔ Learn Urdu کے حوالے سے جو پہلا صفحہ ہے، اس کی جانب خصوصی توجہ چاہتا ہوں، اس صفحے پر English, Urdu کے عنوان سے رومن اسکرپٹ میں انگلش کے الفاظ اور جملے لکھے گئے ہیں اور دوسری جانب اس کے معانی دیے گئے ہیں۔ یہ سائٹ اغلاط سے بھرپور ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

انگلش کا جملہ	اردو ترجمہ
He eats an apple	Woh sev khaatein hai
He has eaten	Woh khaa chukhey

صرف ان دو جملوں کو دیکھیں تو پہلے جملے میں اردو کے "وہ" کو ہندی کے "وَہ" کا تلفظ دیا گیا ہے۔ اور ہندی ہی کی طرح "سیب" کو "سیو" لکھا گیا ہے اور 'چکے' کو 'چکھے' لکھا گیا ہے اسی طرح کی کئی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اسلامی سائٹس ہیں جو عربی، اردو سکھانے کے اعتبار سے اہم ہیں۔ مگر ان کے بھی اپنے اپنے دائرۂ کار ہیں۔ مختصر یہ کہ اردو Learning کے سائٹ تو بہت ہیں، جن کی تعداد ہزاروں میں ہیں مگر زیادہ تر سائٹ محض حرف اور زبان کی بات کرکے سرسری گزر جاتے ہیں یا وہ Group chart کے سائٹ ہیں یا معمولی انفارمیشن کو Carry کرتے ہیں۔ جدید تر ٹکنالوجی کا استعمال اور انٹرنیٹ کے ذریعے اردو زبان کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں جو تساہلی برتی جا رہی ہے وہ باعث تشویش ہے۔ میں فارسی زبان سیکھنے کے لیے بنائے گئے ایک سائٹ کی مثال دینا چاہوں گا۔ easypersian.com کے نام کا سائٹ 75 اسباق پر مشتمل ہے اور Free access ہے، جو انگریزی زبان کے ذریعے فارسی سیکھنے کا بہترین سائٹ ہے۔ اس میں Audio کی مدد سے تلفظ اور ادائیگی پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس سائٹ کو اسباق کے لحاظ سے ہفتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ زبان سیکھنے میں جو بھی عناصر معاون ہوتے ہیں حتی الامکان ان کا خیال رکھا گیا ہے۔ اردو میں بھی اس طرح کے سائٹ بنانے کی ضرورت ہے۔ ایسے سائٹ کی موجودگی سے نئی نسل کی بڑی آبادی اس سے مستفید ہو سکے گی۔ اس وسیلے کو اردو ادب اور زبان دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی بہت زیادہ گنجائشیں موجود ہیں۔ ادب کے حوالے سے تو جو کام اب تک کیے گئے ہیں وہ تشفی بخش ہیں۔ اردو ادب کی Digital library، ادبی و تہذیبی رسالے، اخبارات اور کتابیات کے مختلف سائٹ موجود ہیں۔ لیکن اسے آخری منزل نہ تصور کیا جائے اس سمت ابھی اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں رو بہ عروج رہنا ہے تو خلاؤں کی سیر بھی کرنی ہوگی مگر اس سے بھی زیادہ اس کا مطالعہ اور اس کی تحقیق ضروری ہے۔ زبان کی تدریس کے لیے سائبر اسپیس کے استعمال کی جہاں تک بات ہے تو یہاں وسائل بے شمار ہیں اور طریقے بھی ہزار ہیں۔ آڈیو، ویڈیو اور ڈیجیٹل تکنیک کی مدد سے ہم ان مسائل پر بھی قابو پا سکتے ہیں جو عام طور پر نوآموز طلبہ کو پڑھانے میں پیش آتے ہیں۔ ان میں سے دو مسائل بہت ہی اہم ہیں۔ تلفظ کا مسئلہ اور رسم خط کا مسئلہ۔ ان نکات کو ذہن میں رکھ کر اگر Urdu Learning کے سائٹ بنائے جائیں تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس کام میں ماہرین لسانیات، تکنیکی ماہرین اور سوفٹ ویئر انجینئروں کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

□□□

پتہ:
SIL & C.S.
CIL, J.N.U.,
New Delhi-110067

تحریر: راج رانی، رنجنا اروڑا
تلخیص و ترجمہ: الطاف انجم

بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک

ہندوستان میں عرصۂ دراز سے بنیادی تعلیم کی منصوبہ بندی اور اس کے انتظام و انصرام میں ذات برادری کا خاصا دخل رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کی ماہیت اور ساخت میں تبدیلی بھی آتی رہی۔ بنیادی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کئی کمیشنوں اور کمیٹیوں نے اس میں مختلف ذات برادریوں کے اشتراک کی سفارشیں کی ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی نے مقامی سطح پر تعلیمی میدان میں مختلف فرقوں کے کردار کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ قومی اشتراک اور تعلیمی لامرکزیت کی ضرورت کو پنچایتی راج کے تحت آئین ہند کی 73ویں اور 74ویں ترامیم میں بطور خاص واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے ملک کی بیشتر ریاستوں میں بنیادی تعلیم کی منصوبہ بندی اور انتظام میں مختلف فرقوں کا اشتراک شامل رہا ہے۔ مقامی سطح پر بنیادی تعلیم کو بہتر بنانے میں یہ اشتراک ایک موثر حکمت عملی کے طور پر سامنے آیا ہے۔

تعلیم ایک سماجیاتی عمل ہے جسے طلبہ، اسکول، اساتذہ اور والدین کے درمیان اشتراک سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ یہ بات اس وقت تک بے معنی ہے جب تک لفظ ''اشتراک'' کو صحیح طور پر واضح نہ کیا جائے۔ اگرچہ اسکول، اساتذہ اور طلبہ کا کردار اس تناظر میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن والدین اور مختلف ذات برادریوں کا کردار غیر واضح اور مبہم ہے۔ عالمی سطح پر تعلیمی منصوبہ سازوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ بنیادی تعلیم کو معیاری اور مقداری دونوں اعتبار سے فروغ دینے کے لیے آبادی کے سبھی حصوں کی بامعنی شرکت نہایت ضروری ہے۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مختلف فرقوں کے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے، ان کی علمی استعداد میں اضافہ کرنے، ان کی صحت اور معیار زندگی کو بہتر بنانے کا راز سماجی اشتراک میں مضمر ہے۔ وسیع تناظر میں صحت عامہ سے لے کر تعلیم تک مشترکہ مفادات میں ربط پیدا کر کے اجتماعیت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں گاؤں کا تصور ایک علاقائی اکائی کے طور پر مروج رہا ہے جہاں رہنے والے مختلف ذاتوں اور مذہبی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں تو بھی ان کی تعلیمی ضرورتیں بڑی حد تک یکساں ہوتی ہیں۔ اے. آر. ڈیسائی نے اپنی مشہور کتاب ''رورل سوشیالوجی'' میں لکھا ہے:

''لفظ 'کمیونٹی' کو کئی دہائیوں سے مذہبی یا ذات پات پر مبنی گروہوں کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ یا بعض اوقات اقتصادی گروہوں کا، جو ضروری نہیں کہ ایک ہی علاقے میں رہتے ہوں لیکن ملک میں مشترکہ ترقیاتی پروجیکٹ کے شروع ہوتے ہی پورے گاؤں کے طبقات کو ذات پات، مذہب اور اقتصادی ناہمواریوں سے بالاتر ہو کر ایک ہی کمیونٹی تصور کیا گیا۔''

متعدد طبقات یا گروہ غیر متوازن طریقے پر ایک ہی سماج میں موجود ہوتے ہیں۔ تعلیمی پروگرام اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر بنائے جانے چاہئیں۔ سماجی اشتراک کی نشاندہی کرنے والے عناصر میں ایک عنصر یہ بھی ہے کہ ایک اسکول میں بچوں کی تعداد کتنی ہے۔ جتنی زیادہ تعداد ہوگی اتنے ہی زیادہ طبقوں کی شراکت ممکن ہو سکے گی۔ اس طرح کے اشتراک سے سماج کی ترقی کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے کیونکہ اس سے ترقی کی سب سے اہم ضرورت یعنی تعلیم کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

گجرات کے 'شکشا کرمی' اور 'لوک جنبش پروجیکٹوں' کے تناظر میں اگر دیکھیں تو سماجی اشتراک میں ان لوگوں نے حصہ لیا جن کو بنیادی تعلیم تک رسائی حاصل نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو معمولی۔ بے شک ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کرنا مشکل ہے تاہم سماج کے اشتراک کا تصور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ مختلف سماجی اور اقتصادی گروہ ایک ہی چھت کے نیچے اس مقصد کے لیے کام کریں۔ عملی طور پر سماج کو چاہیے کہ ایک مخصوص علاقے کے ہر سطح کے لوگوں کی نمائندگی کرے۔

بنیادی تعلیم کے معیار کو فروغ دینے میں سماجی اشتراک کے کردار کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ کچھ مشاہدات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پنچایتی راج کے اداروں نے تعلیمی نظام میں بہتری کے لیے بہت اچھے کام کیے لیکن والدین کی راست شمولیت سے بھی مثبت نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں مدھیہ پردیش کی ''ایجوکیشن گارنٹی اسکیم'' (EGS) کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ کچھ معاملوں میں والدین نے آگے آکر تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بات پیسے کی ہو یا زمین کی، اسکولی عمارت کی تعمیر و مرمت کی ہو یا اساتذہ اور طلبہ کی روزانہ حاضری کی یا روزمرہ اسکول کی سرگرمیوں کی، ان سب معاملوں میں والدین اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دیہی تعلیمی کمیٹیاں ایک

موثر وسیلہ ہیں جو آئین ہند کی 73 ویں اور 74 ویں ترامیم کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ ان کا مقصد مقامی لوگوں کو وسیع پیمانے پر تعلیمی نظام میں شریک کرنا ہے۔ اس طرح کی دیہی تعلیمی کمیٹی سات سے پندرہ ممبران پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ایک تہائی تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ اس میں درج فہرست ذاتوں/درج فہرست قبائل/اقلیتوں/والدین/اساتذہ/آنگن واڑی کارکنان اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ایک گاؤں کی تعلیم کی ذمہ داری اس کی دیہی تعلیمی کمیٹی کے ذمہ ہوتی ہے۔ تعلیم بالغان کی نگرانی، بچوں کی نگہداشت، رسمی اور غیر رسمی بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ سماج کے تمام طبقوں کی تعلیمی نظام میں شمولیت کو یقینی بنانا دیہی تعلیمی کمیٹی کے اہم کام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کے طلبہ کی تعداد بڑھانا، اسکول کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد کرنا، اسکول کی ترقی کے لیے وسائل تلاش کرنا، بنیادی تعلیم کی ہمہ گیریت کے حصول کے لیے منصوبے وضع کرنا اور دوسرے شعبوں سے روابط رکھنا جیسے امور دیہی تعلیمی کمیٹی کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔

دیہی تعلیمی کمیٹی کے ممبران کسی بھی وقت اسکول کا معائنہ کرنے کے مجاز ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اعلیٰ حکام کو اسکول کی کارکردگی، اساتذہ اور طلبہ کی حاضری اور اسکولوں کی ضروریات کے بارے میں آگاہ کر سکتے ہیں۔ اسکول کا تعلیمی کلینڈر اور سالانہ بجٹ متعین کرنے کے علاوہ اسکول کی مرمت وغیرہ کا کام بھی دیہی تعلیمی کمیٹی کے دائرۂ اختیار میں ہے۔

تعلیمی عمل میں سماجی اشتراک کی اہمیت اور افادیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نظام نے مختلف سماجی گروہوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ تعلیمی ماحول پر اثر انداز ہو سکیں۔ تعلیمی نظام میں سماجی اشتراک کے حدود و امکانات کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

- والدین کو اس امر سے باخبر کرنا کہ بچوں کو روزانہ اسکول بھیجنے کی اہمیت کیا ہے۔
- سماجی وسائل کو کام میں لا کر تعلیم سے محروم علاقوں میں تعلیم کا انتظام کرنا۔
- نئے اسکولوں کی منصوبہ سازی کے عمل میں شریک رہنا۔
- نئے اسکولوں کا انتظام کرنا۔
- اسکولوں کی بہبود کے لیے کمیٹی قائم کرنا جو مقامی ممبران پر مشتمل ہوتی ہے۔

لوک جنبش پروجیکٹ 1992 میں راجستھان میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے تحت بنیادی تعلیم کی ہمہ گیریت کے نشانے کو پورا کرنے کے ساتھ لامرکزی منصوبہ سازی اور سماج کے تعاون پر زور دیا گیا۔ لوک جنبش پروجیکٹ کا انتظام اور اس کی منصوبہ بندی کی بنیاد سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کے باہمی تعاون پر ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت تعلیم کے لیے عوامی تحریک شروع کی گئی تا کہ ہر سطح پر عوام کی شمولیت یقینی بن جائے۔

لوک جنبش کا اہم کام دیہی علاقوں میں جانا، وہاں کے لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا، تعلیم کے لیے ضروری چیزیں فراہم کرنا اور بی.ایس.جی. کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ اس کا عملہ عوام کے ساتھ رابطہ کر کے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اچھی کارکردگی کے لیے ماحول تیار کرتا ہے۔

ہر گاؤں میں ایک بنیادی جماعت بنائی جاتی ہے اور اس میں نصف ممبران عورتیں ہوتی ہیں بعض اوقات عورتوں کے الگ گروپ بھی ہوتے ہیں۔ اس مہم میں ان لوگوں کی شرکت پر زور دیا جاتا ہے جو تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ تربیت کے بعد بنیادی جماعت لوگوں سے ملاقات کر کے گاؤں کی تعلیمی صورت حال کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ لوک جنبش نے اپنی کوششوں اور گاؤں والوں کے تعاون سے اسکولی عمارتوں کی مرمت اور تعمیر اور نئے اسکول قائم کرنے نیز بچوں کے باضابطہ طور پر اسکول جانے اور اسکولوں کا تعلیمی معیار بڑھانے کے لیے سماج کو پابند عہد بنانے پر زور دیا ہے۔

ایم.وی. فاؤنڈیشن حکومت ہند سے منظور شدہ ایک تنظیم ہے جو مرکزی دھارے کے بچوں کے رسمی تعلیمی نظام کے لیے کام کرتی ہے۔ آندھرا پردیش کے ضلع رنگا ریڈی میں شنکر پلی منڈل کے 30 گاؤں سے شروع ہونے والا یہ پروجیکٹ اب اس ضلع کے دیگر منڈلوں تک پہنچ گیا ہے۔

بچہ مزدوری کی برائی کو جڑ سے اکھاڑ دینے اور بنیادی تعلیم کی ہمہ گیریت کے تصور کو اسکولی بچوں میں مقبول بنانے کے لیے یہ تنظیم درج ذیل حکمت عملیاں استعمال کرتی ہے:

1. اسکولی اور غیر اسکولی بچوں کی صورت حال کا جائزہ لینا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ بچوں کے اسکول نہ جانے کی کیا وجوہات ہیں۔
2. عوامی اشتراک کے معاملے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے لوگوں میں بیداری پیدا کرنا۔
3. نوجوانوں کے فورم بنانا اور مقامی سطح پر ایسے رضاکار تلاش کرنا جو اسکول اور سماج سے مسلسل تعاون کریں۔
4. پانچ سے آٹھ سال تک کے بچوں کا اسکول میں اندراج کرانا۔
5. اسکول سے باہر کے نو سے چودہ سال کے بچوں کے لیے غیر رسمی تعلیمی مراکز قائم کرنا۔

ایم.وی. فاؤنڈیشن کا یہ ماننا ہے کہ عملی طور پر سماجی تعاون ہی بچوں کو تعلیم فراہم کرنے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے۔ سارے گاؤں میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ اسکول تمام لوگوں کی ملکیت ہے۔ اس طرح یہ پروجیکٹ کمیونٹی

شمولیت کو ایک طرف والدین اور رضا کاروں اور دوسری طرف منڈل ایجوکیشن کمیٹی کے ذریعے یقینی بناتا ہے۔ والدین اور دیگر افراد خانہ کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اسکول کے بارے میں اپنی توقعات ظاہر کریں۔

لامرکزی نظام تعلیم کے مطابق ہر اسکول ایک منفرد ادارہ ہے۔ اس لیے ہر اسکول کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنانے کی ضرورت ہے۔ موثر کارکردگی کے لیے اسکول کے لیے ترقیاتی منصوبے وضع کرنا ضروری ہے جو مختلف فریقوں کے رول اور ذمہ داریوں کو خصوصیت کے ساتھ اجاگر کریں۔ اسکول کے کارپردازوں پر منصوبے کی تشکیل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اساتذہ کے لیے تربیتی ادارے، بلاک ریسورس سنٹر اور ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ بالترتیب سب ڈسٹرکٹ اور ڈسٹرکٹ سطح پر ہوتے ہیں جو اساتذہ کی تربیت جیسے اہم کام انجام دیتے ہیں۔ ڈائٹ کے رہنما اصولوں میں سے ایک کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔ ''وی۔ای۔سی ممبران، سماجی رہنماؤں، نوجوانوں اور دوسرے رضا کاروں کو جو تعلیمی فروغ کے لیے کام کرنا چاہتے ہوں، تربیت اور ضروری معلومات بہم پہنچانا'' اس کے علاوہ تعمیری پروگراموں میں اسکول کی شرکت، تعلیمی منصوبہ بندی، نگرانی اور وسائل کے استعمال'' وغیرہ کے بارے میں آگاہی اور مہارت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ ایک تربیتی پروگرام منعقد کرکے یا ایک بار تربیتی مواد تیار کرکے مطمئن ہو جانا، مناسب نہیں۔ ضروری ہے کہ یہ عمل مسلسل جاری رہے۔ عوامی اشتراک کو قومی اور عالمی سطح پر ''سب کے لیے تعلیم'' کے مقصد کے حصول کے لیے ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ عوامی اشتراک کے معنی وقت کے ساتھ ساتھ اور خصوصاً 1986 کی قومی تعلیمی پالیسی کے بعد بدلتے رہے ہیں۔ صرف ایک صارف کی نظر سے تعلیم اور اس کے متعلقات کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ تعلیم کی منصوبہ بندی اور انتظام و انصرام ایک بنیادی سماجی ضرورت ہے جس کا گہرا تعلق والدین، اساتذہ اور اسکول کے کارپردازوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہنے سے ہے۔

(بشکریہ ''دی پرائمری ٹیچر''، جولائی۔ اکتوبر 2006، نئی دہلی)

□□□

مترجم کا پتہ:
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibawli, Hyderabad-500032 (A.P.)

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-066 110

تحریر: شمبھو ناتھ
تلخیص و ترجمہ: احمد کفیل

قاری کی بازیافت

کتابیں ذہنی کشمکش اور شک سے وجود میں آتی ہیں۔ اس لیے کتابوں کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک سماج کے افراد میں شک کرنے کی قوت قائم رہے گی۔ گذشتہ کچھ دہائیوں سے انسانی خواہشات پر بازاری اشیا کا غلبہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض دوسری چیزوں کی طرح کتابوں کی بھی حد بندی ہو جائے گی۔ انسانیت، انسان کی فیصلہ لینے کی صلاحیت اور اس کا تنقیدی نقطۂ نظر حاشیے پر چلا جائے گا تو کتابیں بھی بے معنی ہو جائیں گی۔

آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کا بیشتر ذخیرہ کتابوں اور رسائل سے پرے انٹرنیٹ کی دنیا میں موجود ہے تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں بہت کچھ "غیر موجود" بھی ہے۔ بلکہ وہاں ہر "موجود" کے پس پشت سیکڑوں چیزیں "غیر موجود" ہیں۔

بازار کے باہر ایک بڑی دنیا ہے جس میں شہری ہیں، ایسے افراد ہیں جو سوچتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ سامان فروخت نہیں ہیں۔ آج بھی سماج میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جن میں یہ اعتماد سانس لے رہا ہے کہ ادب میں سچائی ملتی ہے اور کچھ "مختلف" ملتا ہے۔ دراصل یہی بات تاریخ، سائنس یا اقتصادیات کی کتابوں کو بھی 'ادب' بناتی ہے۔ حالیہ اچھی کتابوں میں ان موضوعات کی خالص شکل نایاب ہے۔ اگر ملتی بھی ہے تو مشترکہ شکل میں۔

ہر زمانے میں ادب کو جدت اور روایت دونوں نظریوں سے دیکھا گیا ہے۔ آج یہ طے کرنا لازمی ہے کہ کیا ادب محض ادب برائے ادب کا معاملہ ہے، یہ ذاتی تفریح کی چیز ہے، ایک منافع کی تجارت ہے یا حقیقی معنوں میں سماجی معاملہ۔ ادب ہر زمانے میں ماحول کا مرکز ثقل رہا ہے۔ عوامی کاروبار کے معاملے میں نج کاری بھلے ہی تازہ معاملہ ہو، ادب کی نج کاری کئی دہائی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ادب کا بہت سارا کاروبار نجی کمپنیوں کی طرح چلنے لگا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرا مسئلہ بھی رہا ہے، وہ ہے حکمراں حلقے کا دباؤ۔ ادب کسی بھی دور میں "نجی" اور "سیاسی" میں اتنی بری طرح منقسم نہیں تھا جس طرح پچھلی کچھ دہائیوں میں ہوا ہے۔ اس سے عام لوگوں میں ادب کے تئیں اعتقادات میں کمی آئی ہے۔ ادب کے چاہنے والے بھی کم ہونے لگے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب کو سماج کا ترجمان بنانے کی جو شعوری کوششیں انیسویں صدی میں شروع کی گئی تھیں وہ ختم سی گئی ہیں۔

پوری دنیا میں ادب صدیوں سے عوامی معاملہ رہا ہے، عام لوگ اس میں شریک تھے۔ سائنس اور ترسیلی تحریک کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے سوچنا چاہیے کہ خود کتاب، دنیا کی ادبی شخصیات کو عام لوگوں سے منقطع کرنے کی کتنی ذمہ دار ہے۔

عوام کو اب بھی بڑے پیمانے پر کتابوں کی ضرورت ہے۔ برقی ذرائع کے باوجود کتابوں کا کوئی بدل نہیں ہے جس طرح مختلف مشروبات کے باوجود پانی کا بدل نہیں ہے۔ ہر زمانے میں ادب ایک تہذیبی عمل رہا ہے اور اس طرح اس کی زندگی تغیر پذیر ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک تہذیبی عمل کے روپ میں ادب کچھ خاص قسم کی سرگرمیاں چاہتا ہے۔ سماج میں بری چیزیں پٹرول کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں جب کہ اچھی چیزوں کو پھیلانے میں انتہائی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ "ادبیت" تبھی قائم رہ سکتی ہے جب "سماجیات" باقی ہوگی۔

سارتر اور کامو کے درمیان ادب، آزادی اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو لے کر ایک بحث چھڑی تھی۔ اس میں ایک بات یہ سامنے آئی تھی کہ ادب سیاسی طور پر خود کتنا زیادہ اہم ہے۔ اسی حوالے سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ سماج میں قاری کا ہونا کتنا اہم ہے۔ یہ خود سماج کے سماج بنے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ادب کا قاری ہونا ہنگامے سے باہر نکلنا ہے۔ جھنڈ سے باہر آنا ہے۔ کتاب کا کام ہے ناظر کو منفی سے مثبت کرنا، اسے منجمد سے حرکی بنانا، اس پر عمل کی اہمیت واضح کرنا۔ ناظر کا قاری بننا، کچھ سوچنا شروع کرنا ہے، فکر مند بننا ہے۔ قاری کو محض ناظر بنا دینا یا مغربی موسیقی کا سامع بنا دینا اس کی اندرونی کائنات کو مسمار کر دینا ہے۔ ادب کی سیاسی وابستگی کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ آدمی کو سوچنے اور فکر کرنے والا انسان بناتا ہے۔ کیونکہ ایسے افراد کے بغیر سماج کا تصور ممکن نہیں۔

ادب کا قاری کسی خاص نقطۂ نظر کی نمائندگی نہیں کرتا۔ وہ کسی خاص نقطۂ نظر کا آدمی ہوتا ہی نہیں ہے۔ بھلے ہی تخلیق کار ایسا ہو لیکن قاری ایسا نہیں

ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کار کسی اجنبی گوشے سے دباؤ جھیلتا ہے کہ اس کا مشاہدہ کسی نکتے پر ایسی جگہ بھی پہنچے جہاں دوسرے نقطۂ نظر کے لوگ بھی اس کے مشاہدات کو محسوس کر سکیں۔ ایک اچھے تخلیق کار سے یہ امید لازمی ہے کہ وہ ''انفرادیت'' کے ساتھ ساتھ ''آفاقیت'' کو بھی اپنے دائرۂ تحریر میں سمیٹ لے۔

ہر زندہ سماج میں قاری ہوتا ہے بھلے ہی اس کی شکل وصورت غیر واضح ہو۔ ایک خطیب کو یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ ایک تخلیق کار کے مخاطب یعنی اس کے قارئین اس کے سامنے نہیں ہوتے، وہ واضح نہیں ہوتے۔ وہ میلے ٹھیلوں، تعلیمی اداروں اور شہر کے چوراہوں پر چہل قدمی کرتے نظر آکر بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہم جتنا گمان کر سکتے ہیں قارئین اس سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں صارفیت کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ آزادی اور اپنے وجود کی شناخت کے لیے بے چینی پیدا ہوئی ہے اور ذہنی الجھنیں اب وہاں بھی موجود ہیں جو جگہیں پرسکون تھیں۔ تعلیمی بیداری کے سبب قارئین کے نئے نئے گروہ بن رہے ہیں۔ قارئین اپنی آزادی کے لیے بے چین ہیں۔ اب ہر فرد ایسا محسوس کرنے لگا ہے کہ محض خبر رسانی کے ماحول میں ہم نے بہت کچھ گنوا دیا ہے۔ ہر معاشرے میں ایک مقام کے بعد گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے، فرد اپنی بے چہرگی سے ایک دن گھبرا اٹھتا ہے۔ انسانی قوت تخلیق محدودیت کے حصار میں بے دم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جن میں قاری کی بازیافت لازمی ہو جاتی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جن ستا'' دہلی، مورخہ 24 ستمبر 2006)

❑❑❑

مترجم کا پتہ:
301-E, Brahmaputra Hostel
JNU, New Delhi-110067

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت: -/175 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیاتِ عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ ''مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مردف دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشنِ بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بہ زبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے متعدد نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت: -/128 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

انیس چشتی

اردو اور ہندی کا لسانی ارتباط

ہندی اور اردو، یہ دونوں زبانیں آریائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے درمیان جو سب سے بڑا فرق پایا جاتا ہے وہ رسم الخط کا ہے۔ ہندی والوں نے ناگری رسم الخط اختیار کیا اور اردو والوں نے عربی فارسی رسم الخط کو ترجیح دی۔ اسی بنیاد پر بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں اور ان میں کسی قسم کی لسانی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ نتیجتاً ہم لسانی جزیروں میں منجمد ہو گئے اور اپنی زبانوں کو مل جل کر ترقی دینے کے تعلق سے سوچنا ترک کر دیا۔ حالانکہ آزادی کے بعد کوشش اس بات کی ہونی چاہیے تھی کہ دونوں زبانیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اجتماعی طور پر ہندوستانی عوام کو اپنی جانب متوجہ کرتیں، نتیجتاً "ہندوستانی" زبان پورے ملک میں راہ پا جاتی اور دفتروں سے لے کر بازاروں تک اور عدالتوں سے لے کر گلیاروں تک اسی کا بول بالا ہوتا۔ گاندھی جی نے ان دونوں زبانوں کے تعلق سے کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ عوامی زبان اسی کو کہتے ہیں جو گلیوں میں بھی بولی جائے اور عدالتوں میں بھی سمجھی جائے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ٹی.وی. سیریلوں اور فلموں کے بھی مناظر میں عدالتی کارروائی دکھاتے وقت تعزیرات ہند، دفعہ فلاں فلاں، فاضل وکیل، گواہوں کے بیانات، چشم دید گواہ، موقعۂ واردات، قید با مشقت، باعزت بری کرنا، مقدمے کی سماعت اور ملزم اور جرح جیسی عربی اور فارسی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقی زندگی میں جب مقدمے کی کارروائی شروع ہوتی ہے تو وہ یا تو مقامی زبان میں یا پھر انگریزی میں ہوتی ہے اور مقدمے کا فیصلہ انگریزی زبان میں سنایا جاتا ہے۔

اب بھی وقت گیا نہیں ہے کہ ہم لسانیات کی کتابوں کی گرد جھاڑیں اور ماہرین لسانیات اور زبان دانوں کا ایک گروپ تیار کر کے انھیں قومی سطح پر اس خدمت پر مامور کریں کہ وہ لسانی دوریوں کو تلاش کرنے کی بجائے ملک کی مختلف زبانوں میں نزدیکیاں کو تلاش کریں اور زبانوں کے جغرافیائی بلاک تیار کر کے وہاں کے عوام کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیں۔ مثلاً یہ دیکھا جائے کہ کیرالا، سری لنکا اور مالدیپ کی زبانوں کے رسم الخط الگ ہونے کے باوجود ان کی لسانی اکائیاں کیا ہیں؟ واضح ہو کہ مالے زبان کا رسم الخط عربی ہے۔ اسی طرح یہ بھی دیکھا جائے کہ گجراتی، مراٹھی اور بنگالی زبانوں میں کیا لسانی یگانگت ہے؟ سندھی زبان کیوں جاں بلب ہے؟ اور کیا اس کے جسم میں دوڑنے والا عربی خون کشمیری، پنجابی اور سرائیکی وغیرہ کی پیوندکاری سے اپنے اظہار کے لیے نئے افق تلاش کر سکتا ہے؟ اسی طرح تامل، تیلگو اور کنڑ کا وہ کون سا لسانی فارمولہ تیار کیا جا سکتا ہے جو انھیں انڈمان نکوبار اور پھر خلیج بنگال کے ذرا اس پار ملیشیا اور انڈونیشیا سے مربوط کر سکے۔ یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ان مختلف تہذیبی ممالک کو جغرافیائی قرب و بعد کے باوجود تعلیمی پروگراموں کی حد تک کسی ایک "قومی خلائی کمیونیکیشن سسٹم" کے ذریعے کیونکر مربوط کیا جا سکتا ہے؟

اگر یہ لسانی ارتباط غیر آریائی زبانوں کے درمیان ممکن ہے تو پھر اردو اور ہندی کے درمیان کیوں کر ممکن نہیں ہے؟ ہم تو نہایت ذمے داری کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ ملک کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت یہ کام سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ اردو اور ہندی میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک زبان کی موت دونوں کی موت کی ذمے دار ہوگی۔ دونوں زبانوں کے رسم الخط جاننے والوں اور ماہرین کی بڑی تعداد بھی موجود ہے، ان لوگوں سے دونوں زبانوں کے ارتباط کا کام لینا مفید ہے۔

ان دونوں زبانوں کے ارتباط سے مراد یہ ہے کہ ناگری رسم الخط لکھنے والے اردو رسم الخط کو لکھنے اور پڑھنے لگیں۔ اسی طرح اردو لکھنے والا شخص ناگری رسم الخط میں لکھ اور پڑھ سکے۔ راشٹریہ بھاشا کی سند لینے والوں کے لیے ایک عرصے تک اردو رسم الخط کو لکھنا اور پڑھنا ضروری قرار دیا جاتا رہا ہے، لیکن اب اس روایت میں وہ پہلا سا تسلسل دکھائی نہیں دیتا۔ ہندی اداروں اور اسکولوں میں اردو رسم الخط کی شناخت کو لازمی قرار دیا جانا ضروری ہے۔ اردو والے اگرچہ ناگری رسم الخط سے آشنا ہوتے ہیں، تاہم اس میں نکھار لانا ضروری ہے۔ آج کے دور میں لوگ لکھنے سے کترانے لگے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ کمپیوٹر ہے۔ تکنیکی ماہرین نے اردو ہندی کی اس قباحت کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ سی.ڈیک نامی ادارے نے ایک عرصہ قبل ایک انوکھا سافٹ ویئر تیار کیا ہے، جو گسٹ کارڈ کہلاتا ہے۔ اس میں اگر آپ اردو کی کوئی عبارت ٹائپ کرلیں تو اسے ایک کمانڈ کے ذریعے دیوناگری رسم الخط میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور اسی عبارت کو مزید ایک کمانڈ کے ذریعے رومن رسم الخط میں پڑھا اور چھاپا جا سکتا ہے۔ یہ عمل Transliteration کہلاتا ہے۔ یہ سافٹ ویئر پارلیمنٹ اور

ریلوے بورڈ کے پاس موجود ہے، لیکن عدم استعمال کی وجہ سے اس میں موجود اردو زبان کا رسم الخط ناقابل استعمال ہو گیا ہے۔ اردو اور ہندی والوں کو سب سے پہلے اس سافٹ ویئر میں اردو رسم الخط کے احیا کی کوشش کرنی چاہیے۔ ریلوے رزرویشن کے چارٹ میں انگریزی اور ہندی رسم الخط میں مسافروں کے ناموں کی فہرست اسی سافٹ ویئر کا کارنامہ ہے۔ اسی سافٹ ویئر کو ترقی دے کر بعد میں Leap اور گرامر بیسڈ مشین ٹرانس لیشن (مشینی ترجمہ کاری) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو بڑی حد تک زبان دانی اور لسانی دوریوں کو لسانی قربتوں اور معنوی مانوسیت میں بدل دے گا۔ جس کے نتیجے میں مختلف مذاہب اور تہذیبیں رکھنے والی قومیتیں ایک دوسرے سے قریب آ سکیں گی اور قومی یکجہتی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔ یہ کام بڑی آسانی سے راشٹریہ بھاشا سبھا، ہندوستانی پرچار سبھا، گاندھی اسمرتی، گاندھی درشن اور اسی طرح ملک بھر میں پھیلے لسانی اور گاندھیائی ادارے انجام دے سکتے ہیں۔ مزید برآں اردو اور ہندی ادیبوں کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ موضوع کا انتخاب تو اپنی مرضی سے کریں لیکن زبان کا انتخاب عوام کو سامنے رکھ کر کریں۔ یعنی آسان زبان کا استعمال کریں۔ یہ زبان پریم چند، خواجہ الطاف حسین حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی زبان کی طرح سادہ اور سلیس ہو۔ آخر کیا وجہ تھی کہ حالی کی "مناجات بیوہ" سن کر گاندھی جی رو دیے تھے۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہی ہندوستانی زبان تھی جس کا گاندھی جی نے مرتے دم تک پرچار کیا تھا۔

❑❑❑

پتہ:
116, Sterling House
1984, Convent Street
Pune-411001

حالی

مصنفہ: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110 066

آمنہ تحسین

ویمنس اسٹڈیز پروگرام

(خواتین کے مسائل کا حل)

آزادی کے بعد خواتین کی خواندگی کے فیصد میں اگرچہ 8.86 فیصد سے 53.67 فیصد کا اضافہ ہوا ہے لیکن آج بھی طالبات کی ترک تعلیم عام بات ہے۔ ثانوی سطح کے آگے کی تعلیم کے حصول میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ پیشہ ورانہ کورسز کی تعلیم لڑکیوں کے لیے غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو غیر صحت بخش غذا کی فراہمی کی بنا پر کمزوری اور بیماریاں قدرے عام ہے۔ حاملہ خواتین کی صحت پر عدم توجہی اور ناقص غذائیت کی بنا پر موت یا پھر کمزور بچوں کی پیدائش کی شرح زیادہ ہے۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لڑکیوں کی جنین کشی یا ہزاروں شیر خوار لڑکیوں کا قتل، جہیز کی اموات میں بے انتہا اضافہ، طلاق کے معاملات میں اضافہ، استحصال، زنا بالجبر، فرقہ وارانہ فسادات سے متاثرہ خواتین، گھریلو تشدد، کم اجرت کے روزگار، خواتین کے گھریلو کام کو غیر پیداواری محنت قرار دے کر نظر انداز کر دینا اور بیوہ وضعیف العمری جیسے مسائل میں جکڑی ہوئی ہیں۔ سماج کی یہ غیر مساوی تقسیم دراصل تمام شعبۂ حیات پر حاوی ہے۔ جو خواتین کی مکمل ترقی کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ یہ جنسی امتیاز اس پدر شاہی نظام کی دین ہے جس میں مرد کو برتری عطا کی گئی ہے اور عورت کو ثانوی درجہ دیا گیا ہے۔ صدیوں سے عورت کی ماتحتی نے اسے خود آگہی سے دور رکھا ہے۔ وہ اپنے حقوق سے نابلد ہے اور اپنے مسائل سے ناواقف۔ یہی وجہ ہے کہ عورت ان سہولتوں سے فیضیاب نہیں ہو پا رہی ہے۔ جو اس کی ترقی کے لیے ہی ہیں۔ خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے سماج میں ایک صالح فکر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ویمنس اسٹڈیز پروگرام ایک ایسا پروگرام ہے۔ جس میں ترقی نسواں کے متنوع مسائل کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ یہ پروگرام ایک طرف سماج میں عورتوں کے مقام کی توجیہہ کرتا ہے تو دوسری طرف عدم فسادات کو ختم کرنے اور ترقی نسواں کے لیے اقدامات کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس پروگرام میں خواتین کے تعلیمی موقف، صحت، مسائل، حقوق اور ترقیاتی منصوبوں و پالیسیوں سے واقفیت اور ان کو خود مکتفی بنانے میں معاون حکمت عملیوں سے واقفیت کرائی جاتی ہے۔

ویمنس اسٹڈیز پروگرام خواتین کی ترقی کے لیے دو رخی حکمت عملی کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ ایک رخ تو یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں "سنٹرز فار ویمنس اسٹڈیز" کے قیام کا مقصد، تدریس، تحقیق، تربیت اور توسیعی پروگراموں کے ذریعہ سماج کے تمام طبقات تک رسائی کی کوشش کی جائے اور مختلف سیمینار، لکچر، شعور بیداری پروگرام، قانون مشاورتوں، مفت ہیلتھ کیمپ، ڈاکیومنٹری فلمز، اشتہارات اور مختلف تربیتی پروگراموں کے ذریعے سماج میں خواتین کے مسائل سے متعلق غور و فکر کیا جائے۔ ویمنس اسٹڈیز پروگرام ایک خاص تعلیمی پروگرام ہے جس میں خواتین کے مسائل سے آگہی، ان کے حقوق سے واقفیت، ان کی صحت کے متعلق معلومات سماج اور مذہب میں ان کی حیثیت، ان کے قانون حقوق اور انھیں خود مکتفی بنانے کے لیے مختلف تربیتی پروگرام کو بھی شامل نصاب کیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں فاصلاتی نظام تعلیم نے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ زیادہ سے زیادہ افراد اس طریقۂ تعلیم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ کسی بھی ترقی یافتہ سماج میں ذہن سازی کے لیے یہ نظام تعلیم بھی بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ویمنس اسٹڈیز پروگرام کو فاصلاتی تعلیم کے مختلف کورسز کے لیے بھی لازم قرار دیا جانا چاہیے۔

ملک میں ہزاروں کی تعداد میں گرلس کالج قائم ہیں۔ ان کالجوں میں "ویمنس سیل" کا قیام ضروری قرار دیا جائے۔ تاکہ لڑکیوں کو ان کے حقوق سے متعلق واقفیت حاصل ہو سکے۔ ساتھ ہی ان کے مسائل کا حل بھی ممکن ہو سکے گا۔

❑❑❑

پتہ:
Dept. of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-32 (A.P.)

زبیر رضوی

دیوان غالب

(ایک تخلیق نواز ماخذ)

غالب بطور شاعر عظیم تھا مگر بطور شخص اس میں خوبیاں کم برائیاں کہیں زیادہ تھیں۔ اس کی زندگی متضاد رویوں کی بنا پر لوگوں کو اس لیے اچھی لگتی رہی کہ اس کی شخصیت کی ناہمواریاں اس کی جاہ طلبی اور قرض پر ٹکی ہوئی بے خواری، اپنی تنگ دستی سے مجبور ہو کر گھر پر جوا کھلانا اور دوسروں کو مراعات کا مستحق دیکھ کر مخالفانہ مہم شروع کرنا اور حسب نسب کے حوالے سے اپنے سماجی مرتبے اور حیثیت پر اصرار کرنا کچھ لوگوں کو غالب کی ذات میں بشریت کے فطری اُبال لگتے تھے گویا غالب نے اپنی شخصیت پر بغیر کسی لیپاپوتی کے اسے ویسے ہی رہنے دیا تھا جو اس کے حصے میں آئے حالات کا تقاضا تھا۔ غالب کی زندگی کی دھوپ چھاؤں نے بھی غالب پرستوں کو رُک کر سوچنے اور اس کی ذات میں مثالیت تلاش کرنے کا وقفہ ہی نہیں دیا کیونکہ غالب نے اپنی شاعری اور اپنے خطوط میں اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ اپنی زندگی میں در آنے والی کمزوریوں اور برائیوں کا قائل کر دینے والے انداز میں ایسا پرزور جواز پیش کیا کہ ملامتوں کے پتھر ہاتھوں سے پھینک دیے گئے۔ غالب کو اپنی شاعری کی عظمت اور اپنی شخصیت کی پذیرائی کا ادراک اور عرفان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس نوآبادیاتی نظام کا قصیدہ خواں بنا اور شاہ کا مصاحب بنا دلی شہر میں اتراتا پھرتا ہے۔ ایک روز اس کی یہی قصیدہ خوانی وقت کی عدالت میں مجرم بنی کھڑی ہوگی اور تاریخ کے پریشان کن سوالوں اور ان میں چھپی نشتریت کا نشانہ بنے گی اور جواب دہ ہوگی۔

غالب مستقبل سے کہیں زیادہ حال اور اس کے ساتھ باندھے ہوئے پیمانِ وفا کا پاسدار تھا اور اس ہنر سے بھی واقف تھا کہ قومی آزمائش اور وطنیت کے بحران سے وہ اپنے شاعر کو کیسے بچا کے لے جائے کہ وقت شاعرانہ عظمت کی جو دستار اس کے سر پر رکھنے جا رہا تھا وہ کسی اور سر کی زینت نہ بن جائے۔ غالب نے جان لیا تھا کہ آنے والے سو برسوں میں لال قلعے کا مستقبل آخری مغل تاجدار کے بجائے نئے انگریز حکمراں کے فرمانوں کا مرہون منت رہے گا اس لیے غالب نہ دستنبو لکھتے ہوئے سیاسی مورخ کی چھبی کے ساتھ سامنے آیا اور نہ اس نے اپنے زمانے کی انقلابی اور اصلاحی تحریکوں سے اپنی ہم آہنگی کا کوئی اشارہ دیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ سیاسی شاعر نہیں ہے وہ تو خالص شاعر ہے۔ ایسا جو اپنے عہد اور اس کی زندگی کو اپنی شاعری کا اٹوٹ حصہ بنا کر اپنے عہد میں سانس لیتا ہے۔ کتنے شاعر، افسانہ نگار آج بھی ہیں جو اپنے سیاسی ایقان کا اظہار کیے بغیر ادب لکھ رہے ہیں۔ اگر ہم آج بھی 1947 سے اب تک کے ہندوستان اور اس کی جنگ آزادی پر کسی بڑے اور قابل ذکر ناول کے لکھے جانے کا انکار کر رہے ہیں تو 1857 کے غالب سے ہم کیوں یہ مطالبہ کریں کہ اس نے اپنے خطوط اور نثر پاروں میں اپنے زمانے کے ہنگامہ خیز سیاسی دور پر اپنے وطنی موقف کے ساتھ مزاحمانہ اور سرکشی والا لہجہ کیوں نہیں اختیار کیا اور اس کی تحریروں میں جسے آج ہم فاشزم کہتے ہیں اس کا چہرہ کیوں دکھائی نہیں دیتا۔

اس تمہید کا آنا اس لیے ضروری تھا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اپنی ساری انسانی کمزوریوں کے باوجود غالب کا 'دیوان' آج بھی اتنا مقبول اور بے حد وحساب پڑھا جانے والا شاعری کا دیوان کیوں ہے؟ میں نے اپنی کتاب ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تھی اور یہ ثبوت فراہم کیے تھے کہ غالب کے دیوان میں دوامیت اور ہر دور کے ذہن کو متاثر اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کچھ ایسی شعری طاقت ہے کہ کوئی بھی ذہن اس کی شاعری کے طلسم خانے میں داخل ہو کر باہر آنے کی راہ نہیں ڈھونڈتا۔

یہ کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ نئی دلی میں افرو ایشین رائٹرس کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں فیض بھی تھے اور سجاد ظہیر بھی۔ وہ ہمارا آٹوگراف جمع کرنے کا زمانہ تھا۔ میں نے آٹوگراف بک فیض کے سامنے رکھتے ہوئے فرمائش کی کہ غالب کا کوئی ایک شعر لکھ دیجیے جو آپ کو بے حد پسند ہو فیض بولے یہ تو بڑا مشکل ہے پھر کچھ سوچ کر لکھا:

نامہ کب تک لکھوں جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

اس ایک شعر میں فیض کا ڈکشن ان کی شعری لفظیات اور ان کی تخلیقی فکر اور اس کے مزاحمانہ تیور سب ہی کچھ تو آ گیا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ غالب ہمارے ادبی منظرنامے میں اکیلا ایسا شاعر ہے جس نے اپنی زبان کے تخلیقی ذہن کو اتنے بڑے پیمانے پر متاثر کیا کہ دیوان حافظ کی طرح دیوان غالب کو

بھی کچھ لوگ فال نکالنے کے لیے معتبر ماننے لگے۔ تفصیلی چھان بین کے بغیر میں نے اپنے دھندلے ہوتے ہوئے حافظے کی مدد سے یہ سوچنے اور مثالیں تلاش کرنے کی کوشش کی کہ اردو شاعری، افسانہ نگاری اور ناول نگاری اور دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرنے والوں نے اپنے شعری، افسانوی مجموعوں اور ناولوں کے نام رکھنے کے لیے دیوان غالب سے کتنا اور کیسا استفادہ کیا ہے؟

اگر فیض ہی سے شروع کریں تو انھوں نے اپنے تین شعری مجموعوں کے نام غالب سے مستعار لیے "نقشِ فریادی"، "نسخہ ہائے وفا" اور "دستِ تہہ سنگ" یہ دلچسپ بات ہے کہ دیوان غالب کی پہلی غزل کا مطلع ہی اس معاملے میں بے حد مقبول ہوا۔ فیض کے علاوہ اس پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں عنوان کے لیے بہترین "کاغذی پیراہن" والا ٹکڑا تھا جو خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے پہلے شعری مجموعے اور عصمت چغتائی نے اپنی سوانح عمری کے لیے پسند کیا۔ خلیل نے "کاغذی پیرہن" اور عصمت نے "کاغذی ہے پیرہن" مستعار لیا۔ میری فہرست کے مطابق دیوان غالب سے شاعروں نے سب سے زیادہ نام اپنے شعری مجموعوں کے لیے مستعار لیے ایسے شاعروں میں ترقی پسند حلقے والے شاعر بھی ہیں جو غالب کے خوشہ چیں ہیں۔ مخدوم کا دوسرا شعری مجموعہ "گل تر" اور عزیز حامد مدنی کا پہلا مجموعہ "دشت امکاں" ہے جس کا ایک بے حد فکر انگریز دیباچہ 'دانش حاضر کے سواد میں' کے عنوان سے مدنی نے لکھا تھا احمد ندیم قاسمی نے "دشت وفا" فراق نے "گل نغمہ" جگر نے "آتشِ گل" اور سیف الدین سیف نے اپنے پہلے غزل کے مجموعے کا نام "خم کاکل" رکھا تھا۔ اختر انصاری نے "بادۂ شبانہ" اور جمیل ملک کی غزلوں کا مجموعہ "سرو چراغاں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ کرشن موہن نے اپنے ایک مجموعے کا نام "دلِ ناداں" رکھا تھا۔ غالب نے خود کو کئی جگہ خراباتی کہا ہے۔ غالب اپنی اس پہچان کی خاطر قرض کی مئے پینے پر ایک 'نادہند رند' ہونے کے جرم میں جیل بھی ہو آئے تھے مگر آخر دم تک کہتے رہے "غالب خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے" عبدالحمید عدم غالب کے ہم مشرب تھے ان کے ایک مقبول شعری مجموعے کا نام "خرابات" تھا۔ فضا ابن فیضی نے اپنے شعری مجموعے کا نام "معنیٔ سبزۂ بیگانہ" رکھا تھا۔ فضیل جعفری کے زیر طبع شعری مجموعے کا نام "افسوس حاصل کا" ہے ایک اور شعری مجموعہ یاد آیا "رگِ جاں" خورشید الاسلام کا ہے۔

اور اب دیکھیں کہ اردو فکشن نے غالب سے کیا کیا مستعار لیا۔ میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ میں نے غالب کے وہ شعر نہیں سنائے جن سے نام مستعار لینے کی تحریک ملی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے حافظوں میں مستعار لیے ناموں کے ساتھ شعر بھی چمک اٹھے ہوں گے۔ قرۃ العین حیدر نے خطوط کے مجموعے کا نام "کفِ گل فروش" اور خاندانی تصاویر کی کتاب کا نام "دامانِ باغباں" رکھا تھا۔ اپنے ایک افسانوی مجموعے کے لیے بانو قدسیہ نے جو نام مستعار لیا وہ تھا "آتش زیر پا" راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی مجموعے کا نام ہے "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" ایوب مرزا نے اپنے ناول کا "دامِ موج" قاضی عبدالستار نے اپنے ایک ناول کا نام "شکست کی آواز" اور رضیہ فصیح احمد نے اپنے مشہور ناول کا نام "آبلہ پا" رکھا تھا۔ فضل احمد کریم فضلی نے اپنے اکلوتے ناول کا نام "خون جگر ہونے تک" دیوان غالب ہی سے لیا تھا۔ اپنے تنقیدی مضامین کے لیے ساجدہ زیدی نے "گزرگاہ خیال" کو ترجیح دی۔ طنز و مزاح کے لیے بھی دیوان غالب خاصا زرخیز ثابت ہوا ہے۔ "خندہ ہائے بے جا" رشید احمد صدیقی اور "حرف مکرر" یوسف ناظم اور سجاد حیدر یلدرم نے اپنے نثر پاروں کے لیے "محشر خیال" نام پسند کیا تھا۔ نثار احمد فاروقی روزنامہ "سیاست" میں ایک کالم لکھا کرتے تھے اس کا عنوان تھا "گویا دبستاں کھل گیا" دیوان غالب کو فیضان کا خزینہ جان کر اپنی کتابوں کے نام رکھنے کا رجحان بے حد توانا ہے۔ یہ تو وہ کچھ نام اور عنوانات تھے جو میں نے اپنی بک شیلف پر رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈال کر نوٹ کیے تھے۔ ویسے بھی میرا مقصد ناموں یا عنوانات کی فہرست سازی کرنے سے کہیں زیادہ اس فیضان اور رجحان کا ذکر کرنا تھا جو ناموں کے متلاشی ادیب کو دیوان غالب کی ورق گردانی کر کے اپنی پسند کا نام وہاں سے مستعار لینے کی تحریک دیتا رہا ہے۔ دیوان غالب کو ایک اہم اور تخلیق نواز ماخذ تسلیم کرنے کا یہ رجحان اور رویہ یہ انکشاف ضرور کرتا ہے کہ غالب کا دیوان اردو والوں کی تخلیقی سائیکی اور خمار و خمیر کا حصہ بن چکا ہے۔ دیوان غالب میں بے شمار عنوان اور نام بکھرے پڑے ہیں جیسے عارض گل، سیر گل، عجب آزاد مرد تھا، رنگِ شکستہ، صدر رنگِ گلستاں، انداز بیاں، ورق ناخواندہ، حکایات خوں چکاں، روزنِ دیوار، صریرِ خامہ، نالہ پابند نے، موجِ خرامِ یار، آوارگی کا آشنا، رقصِ شرر، خندہ ہائے گل، اگلے وقتوں کے لوگ، رخشِ عمر، باغبانی صحرا، خندۂ زیر لب جیسے عنوان ممکن ہے، رکھے جا چکے ہوں۔ یہاں میں نے ان بے شمار افسانوں کا ذکر نہیں کیا جن کے عنوانات دیوان غالب کی دین ہیں۔ اب میں تھوڑا اپنے حوالے سے بھی بات کروں۔

میں نے اپنے سات شعری مجموعوں میں تین نام "خشت دیوار"، "انگلیاں فگار اپنی" اور "سبزۂ ساحل" دیوان غالب ہی سے لیے تھے۔ غالب اور ان کے حوالے سے دلی شاید ایک شہر کی صورت میری غزلوں اور نظموں میں سب سے زیادہ ہے صرف تین شعر اسی حوالے سے:

شہر غالب سے ہمیں اور تو کیا لینا تھا　　اپنی سانسوں کے لیے تازہ ہوا مانگی تھی

سیرِ دنیا سے جو لوٹے تو یہ جانا ہم نے　　شہرِ غالب ترے خوبانِ نظر اچھے تھے

غالب کے خطوں جیسی تہذیب نہیں ملتی　　آداب بڑوں کو اور چھوٹوں کو دعا لکھنا

اس بات کو بچ ہی سمجھیے کہ میں کیف پرور اور بے کیف لمحوں میں غالب کے اس خوبصورت چھوٹے سائز کے دیوان کو اٹھا لیتا ہوں جو مجھے ضمیر نیازی نے اپنے محبت بھرے کلمات کے ساتھ پاکستان سے بھیجا تھا۔ ایک دن دیوان کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں غزل کے اس شعر پر رک گیا:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ شعر پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ کسی بوڑھے ہو گئے رندِ خوش باش کی لاچاری اور صحت کے تنزل اور ملبے کا ڈھیر بن جانے کی شعری تفسیر اور تصویر نہیں ہے بلکہ ایک خراباتی تہذیب کے پروردہ ایسے رندِ خوش انجام کا حیکرِ ملال ہے جو سرمستی اور سرشاری کو مہمیز کرنے والی فضا اور ماحول کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد میں نے ایک ہرے بھرے سرمست و شاداب عہدِ زوال اور اس زوال کو ایک تاریخی یاد کے طور پر سینے میں شمع کی صورت فروزاں رکھنے کے ایسے پر ایک طویل نظم "زوال کا منظر" لکھی تھی۔ نظم شروع ہوتی ہے "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا" اور ختم ہوتی ہے:

یہ قصہ ہے اب کا کہ
آتش کی پیرانہ سالی کے دن ہیں
"نہ ہاتھوں میں جنبش نہ آنکھوں میں دم ہے"
شکستہ حویلی میں بوڑھی کنیزیں
کبھی جب فلک چاندنی سے بھرا ہو
پرانے انگرکھوں پرانی قباؤں کو آداب کرتی ہیں
آنکھوں کی جنبش پہ بندِ قبا کھولتی ہیں
کہن سالہ مئے جام میں ڈالتی ہیں
کبھی خاک میں بجلیاں ڈھونڈتی ہیں

غالب کے مذکورہ شعر کی یہ نظمیہ توسیع کہ جو زوال پا چکی تہذیب اور اس کی نشاطیہ تاریخ کی بازیابی کے سودائے خام کو ظاہر کرتی ہے غالب کے گنجینۂ معانی کے طلسم کا نظم کی صورت میں ایک اعتراف ہی تو ہے۔ یہ نظم بیدار بخت کے انگریزی ترجمے کے ساتھ انترا دیوسین نے اپنے انگریزی رسالے "لٹل میگزین" میں اہتمام سے شائع کی تھی!

□□□

پتہ:
7, Cosmo Apts., Street No. 12
Zakir Nagar, New Delhi-110025

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کلیات علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں "پرواز"، "نئی دنیا کو سلام"، "خون کی لکیر" اور "امن کا ستارہ" اور دوسری جلد میں "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار" "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر"، "لہو پکارتا ہے" اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت: 164 روپے
جلد دوم صفحات: 533، قیمت: 200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔

کلیات حسن نعیم میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت: -/185 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

سرورالہدیٰ

منیر نیازی — غزل کے آئینے میں

نئی غزل کے سیاق میں منیر نیازی کی غزل کا مطالعہ بہت معنی خیز ہوسکتا ہے لیکن ہنوز اس مطالعے کی کوئی روشن مثال سامنے نہیں آسکی۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ موضوع تھا مگر ہماری سنجیدگی کسی اور سمت میں سفر کرتی رہی۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے نزدیک نئی غزل کے سیاق میں منیر کی غزل کا مطالعہ اہم نہ ہو اس لیے کہ متن کی آزادانہ قرأت خود اپنا ایک جواز رکھتی ہے۔ منیر نیازی کی غزل معاصر اردو غزل سے کتنی مختلف اور مماثل ہے اس کا فیصلہ بھی نئی غزل کے سیاق وسباق میں ہی ممکن ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ منیر کی شاعری پر اشفاق احمد اور انتظار حسین کے مضامین نہ صرف اولیت کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ ان سے منیر شناسی کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ یہ دونوں اردو کے معروف فکشن رائٹر ہیں۔ منیر کے شعری مجموعے ''ساعت سیار'' کا دیباچہ فیض نے لکھا تھا۔ فیض کا یہ دیباچہ بہت مختصر ہے لیکن فیض نے چند جملوں میں منیر کی شاعرانہ اہمیت کو واضح کردیا ہے۔ شمیم حنفی کا مضمون ''منیر نیازی ایک آفت زدہ بستی کی دیومالا'' منیر نیازی کی شاعری کا بہترین محاکمہ ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب ''ہم سفروں کے درمیان'' میں شامل ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت منیر نیازی بقید حیات تھے۔ مضمون کے عنوان سے ہی منیر نیازی کی شاعری کا بنیادی مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ اشفاق احمد، انتظار حسین اور شمیم حنفی نے منیر نیازی کی تخلیقی حسیت کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو کوشش کی ہے عام طور پر ہماری تنقید اس تنقیدی رویے سے خالی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تخلیق کار کی دردمندی اور دل سوزی کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ہماری تمام تر توجہ ہیئت پر مرکوز ہوجاتی ہے منیر کے شعروں میں جو لودینے کی کیفیت ہے اس سے کوئی قاری خود کو بچا نہیں سکتا۔ ''پہچان'' الہ آباد نے بھی منیر نیازی پر ایک گوشہ شائع کیا تھا۔ جے۔ این۔ یو۔ میں ڈاکٹر مظہر مہدی کی نگرانی میں منیر نیازی کی شاعری پر علی اصغر پی ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ میں نے اپنے اس مطالعہ کو منیز نیازی کی غزل تک محدود رکھا ہے۔ انتظار حسین کے مضمون کا اختتام ان جملوں پر ہوا ہے جن سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا وہ لکھتے ہیں۔

''ہجرت کا تجربہ، لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو اردو ادب کی باقی نسلوں سے الگ کرتا ہے۔ اس نسل کے مختلف لکھنے والوں کے یہاں اس تجربے نے الگ الگ روپ دکھائے ہیں۔ منیر نیازی کے یہاں اس کے فیض سے ایسا روپ ابھرا ہے جو ایک نئی دیومالا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

ہجرت کا تجربہ خود انتظار حسین کے تخلیقی سفر کا بھی ایک بنیادی حوالہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ خود کو اور منیر نیازی کو دوسری نسلوں سے الگ کرکے دیکھتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے اور اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن نئی شاعری کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ''وہ تو کسی تجربے کے حوالے کے بغیر خالی ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہے۔'' بڑا ہی چونکانے والا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نئی شاعری میں ہجرت کے تجربے کے علاوہ اور جتنی باتیں تھیں یا ہیں ان کا تعلق کسی تجربے سے نہیں تھا اور وہ سب مانگے کا اجالا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نئی شاعری کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو مایوس کن ہے۔ ایک اچھا اور سچا فن کار وقت کے ساتھ ساز باز نہیں کرتا۔ آخر منیر نیازی بھی تو نئی شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ منیر کو پڑھتے ہوئے ہم ہجرت کے تجربے سے گزرتے تو ہیں لیکن یہ تجربہ انسانی زندگی کے مختلف معاملات میں دخیل ہوکر اسے ایک آفاقی تجربہ بھی بناتا ہے۔ اس لیے کسی تجربے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس تجربے سے گزرنے والے کا تخلیقی ذہن اور ویژن کتنا بالیدہ اور بلند ہے۔ نئی شاعری پر بہت لوگ معترض ہوسکتے ہیں اور ہیں لیکن نئی شاعری کا ایک قابل لحاظ حصہ اسی عہد کی پیداوار ہے جس پر ہم طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نئی حسیت کا مفہوم کچھ لوگوں نے جس طرح سمجھا اس پر آج سر پیٹا جاسکتا ہے۔ ایسے میں اگر انتظار حسین یہ کہتے ہیں کہ ''نئی شاعری کا کیا ہے وہ تو خالی ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہے۔'' تو کچھ حیرت کی بات نہیں لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ جزوی اور ادھوری صداقت ہے۔ منیز نیازی نے جس دور میں شاعری کی ہے اس پر نگاہ ڈالیے تو پاکستان اور ہندوستان میں اچھے شاعروں کی ایک ایسی تعداد تھی جس پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب ایک ہی دور میں ایک دوسرے سے مختلف بھی تھے۔

سوال یہ ہے کہ نئی غزل اور نئی شاعری کے بنیادی مسائل کیا تھے اور ہم کن بنیادوں پر کسی شاعری کو نئی شاعری قرار دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں خلط ملط ہوگئیں ہیں۔ میری نظر میں شمس الرحمٰن فاروقی کے دو

مضامین ''نئی شاعری ایک امتحان'' اور'' ہندستان میں نئی غزل'' سے نئی شاعری اور نئی غزل کے خدو خال واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ان کی کتاب ''لفظ و معنی'' میں شامل ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''نئی اردو غزل'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کی پیش کردہ بنیادوں سے بحث کی ہے۔ ان مضامین سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اتنی واضح اور منطقی شکل میں یہ مباحث کہیں اور شاید نہ ملیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''خالص میکانکی اور زمانی نظر سے شاعری سے میں وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو 1955 کے بعد تخلیق ہوئی۔ 1955 کے پہلے کے ادب کو میں نیا نہیں سمجھتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ 1955 کے بعد جو کچھ بھی لکھا گیا وہ سب نئی شاعری کے زمرے میں آتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ 1955 کے پہلے کے ادب میں جدیدیت کے عناصر نہیں ملتے۔ میری اس تعیین زمانی کی حیثیت صرف ایک Refrence سی ہے۔ داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو خرید سکتا ہوں جو ہمارے دور کی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوف ناک احساس گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔'' (لفظ و معنی ص۔ 126)

منیر کی غزل کا زمانہ بھی وہی ہے جو جدیدیت کے عروج کا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ منیر کی غزل کس حد تک اپنے عہد کے نظریاتی مسائل کا ساتھ دیتی ہے۔ میری تمام تر دلچسپی منیر کی تخلیقی حسیت سے ہے اگر منیر کی تخلیقیت کے بعض رشتے جدیدیت سے قائم ہو جاتے ہیں تو اس میں ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ اب وقت کافی نکل چکا ہے اور منیر بھی ہمارے درمیان نہیں ہیں اس لیے منیر کی غزل کے بارے میں معروضی انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ منیر کی شاعری اتنی مستحکم اور توانا ہے، اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منیر کی غزل کی قرأت کے جو تقاضے ہیں انھیں ملحوظ رکھا جائے لیکن قرأت کے تقاضے کا علم بھی قرأت ہی سے آتا ہے۔ منیر کی غزل کو پڑھیے تو اس کا فکری اور لفظیاتی نظام اتنا گھنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ اس کی تفہیم اور تعبیر کا عمل بار بار پڑھنے اور پرکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ منیر نیازی کی کلیات میں 174 غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کی یہ تعداد بہت زیادہ نہیں کہی جاسکتی لیکن ان کی روشنی میں منیر کی غزلیہ شاعری کے امتیاز کو نشان زد تو کیا ہی جاسکتا ہے۔ منیر نیازی کے پہلے مجموعے ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' میں صرف دس غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب'' خدا کے نام'' ہے۔ اور اس کے نیچے قرآن کریم کی ایک آیت درج ہے۔ ان کے ایک دوسرے مجموعے ''دشمنوں کے درمیان شام'' کا انتساب امام حسین علیہ السلام کے نام ہے اور تیسرے مجموعے ''ماہ منیر'' کا انتساب رسول کریم ﷺ کے نام ہے۔ ان انتسابات سے بھی منیر نیازی کے فکری رویے اور تخلیقی ذہن کا پتا چلتا ہے۔ جب عقیدے اور ایمان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی بات کی جارہی ہو ان حالات میں خدا، نبی اور امام حسین کی خدمت میں اپنے شعری سرمایے کو پیش کرنا اپنے ایمان اور عقیدے کی عمارت کو مزید مستحکم کرنا بھی ہے اور ساتھ ہی کسی مشکل وقت میں خود کو بکھرنے سے بچانے کا ایک وسیلہ بھی۔ تخلیق کار کے عقیدے کی دنیا اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے لیکن ایک قاری چاہے کسی بھی نظریے کا حامل ہو وہ تخلیق کار کی روحانیت اور عقیدت کے تہذیبی اور تاریخی ماخذ سے چشم پوشی نہیں کرسکتا اور لازماً وہ شاعری میں حیات و کائنات کے اس تصور کو تلاش کرتا ہے جس پر تخلیق کار کا ایمان ہے۔

منیر نیازی کا تخلیقی ذہن تخلیقی سطح پر جو سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس کے رشتے تاریخ اور تہذیب میں بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں اس میں ظلم و زیادتی کی عصری تاریخ ہی نہیں بلکہ اس کی تمام روایات سمٹ آتی ہیں۔ اس لیے منیر نیازی کی غزل گوئی اپنے سماجی اور عصری سیاق سے جو کچھ اخذ کرتی ہے اس کا اسلوب اسے عصریت سے بلند کردیتا ہے۔ ظلم کی ایک لمبی تاریخ ہے اور ہر ظلم کی تاریخ کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے سے مماثل ہے۔ انسان نے انسان پر جتنی زیادتیاں کی ہیں اس کے حوالے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ منیر نیازی کی غزل میں ان زیادتیوں کا عصری منظرنامہ خود منیر کا دیکھا، جھیلا اور محسوس کیا ہوا ہے۔ اگر وہ ان حالات میں اپنی تاریخی اور تہذیبی روایات کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں اور ان سے تخلیقی سطح پر کوئی قوت اور توانائی حاصل کرتے ہیں تو یہ منیر کی تخلیقی اور حسی ضرورت ہے۔ ''دشمنوں کے درمیان شام'' کا انتساب امام حسین علیہ السلام کے نام ہے۔ اس کتاب کے عنوان کو سامنے رکھیے اور پھر واقعۂ کربلا پر غور کیجیے تو یہ دونوں کس قدر باہم مربوط ہو جاتے ہیں'' تیز ہوا اور تنہا پھول'' ایک ایسا استعارہ ہے جو ہمارے ذہن کو واقعۂ کربلا سے لے کر دنیا کے ان تمام معرکوں کی جانب منتقل کردیتا ہے جو حق و باطل کے مابین ہوئے ہیں، چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب اور قوم سے ہو۔ منیر نیازی کے یہاں واقعۂ کربلا بنیادی طور پر حق و صداقت کا اعلامیہ بن جاتا ہے۔ تیز ہوا میں ایک تنہا پھول دراصل منیر نیازی کی تخلیقی حسیت کا ایک اظہار ہے جس میں کسی قسم کے نام نہاد نظریے یا خارجی دباؤ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو منیر نیازی کے شعری مجموعوں کے انتسابات کے سلسلے میں کچھ باتیں تھیں۔ منیر نیازی کی غزلوں کا مطالعہ تو ان کے تمام سنجیدہ قارئین نے کیا ہے لیکن اگر حافظے پر زور ڈالیے تو گذشتہ کئی برسوں سے منیر نیازی کے چند شعر بار بار مختلف مضامین اور گفتگوؤں میں دہرائے جاتے رہے ہیں۔ ادب کے بہت سے نئے

طالب علموں نے منیر کو ان ہی شعروں کے حوالے سے پہلے پہل پہچانا تھا وہ شعر یہ ہیں:

تم نے تو منیر اپنی عادت ہی بنالی ہے
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا ہے

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

ان تینوں اشعار میں کوئی نادر ترکیب یا انوکھے استعارے نہیں ہیں، پھر ایسی کون سی بات ہے جو ہمیں اپیل کرتی ہے۔ پہلے شعر میں اکتاہٹ کو عادت سے مشروط کر دیا گیا ہے یعنی اکتاہٹ کا سبب کوئی واقعہ نہیں بلکہ عادت ہے لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔ اکتاہٹ کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہے ہی۔ شعر اصل میں خود پر قابو رکھنے اور جینے کے ایک ایسے ڈھنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں اکتاہٹ کے لیے اتنی گنجایش نہ ہو لیکن کیا کیا جائے اگر اکتاہٹ عادت بن جائے۔ خوف اور زیاں کا احساس کیوں کر پیدا ہوتا ہے اور یہ فن کاروں کے یہاں کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس سلسلے میں کوئی ایک بات سب کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی:

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

اس شعر کو پڑھیے تو سماعت میں 'ریل کی سیٹی بجی' کے ٹکڑے سے ایک سمائی پیکر ابھرتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آواز ہے جو کانوں کے ذریعے دل میں درد بن کر اتر رہی ہے۔ اس شعر کا آہنگ پہلے متاثر کرتا ہے اور پھر بعد کو اس کے معنی و مفہوم پر ہم غور کرتے ہیں۔ صبح کاذب کی ترکیب نے شعر کو ایک خاص سمت عطا کر دی ہے۔ صبح کاذب ایسی صبح کو کہتے ہیں جس پر صبح کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ رات ہوتی ہے۔ اس نظر فریبی پر ایک عام انسان کا تاثر جو بھی ہو لیکن منیر نیازی نے جس طرح اسے تخلیقی سطح پر برتا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نئی غزل میں شاید نہ ملے۔ صبح کاذب کی ہوا میں درد کا ہونا لفظ ''کتنا'' درد کی شدت کو اور سوا کر دیتا ہے۔) پھر ریل کی سیٹی سے دل کا لہو سے بھر جانا ایک ایسی سراسیمہ فضا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں۔ وہ کون تھا، کیسا قافلہ تھا کیسے لوگ تھے جن کی بے وقت روانگی اور رخصتی نے متکلم پر ایسی کیفیت طاری کر دی۔ گویا مسافر کو تو جانا ہی تھا لیکن یہ سفر غفلت اور دھوکے میں شروع ہوا۔ ظاہر ہے کہ ریل کی سیٹی اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اب مسافر نگاہ سے اوجھل ہے اور دور جانے والا ہے۔ اس شعر میں بنیادی طور پر وہی ہجرت کا تجربہ شامل ہے جس کا ذکر انتظار حسین نے کیا ہے لیکن اب دیکھیے کہ ہجرت کے تجربے کو کس ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

یہاں بھی ایک زیاں کا خوف ہے لیکن ساتھ ہی اپنی سی کوشش کرنے کا جذبہ بھی ہے بظاہر ایک عشقیہ شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس شعر کا ''وہ'' جس کردار کو سامنے لاتا ہے وہ نہایت منفرد بھی ہے۔

منیر نیازی کے ان اشعار کو بنیاد بنا کر منیر کی پوری غزلیہ شاعری کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہوگا لیکن ان شعروں سے منیر کی تخلیقی حسیت کا ایک پہلو تو سامنے ضرور آتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ میں نے جس زیاں اور خوف کی بات کی ہے وہ منیر کا بنیادی مسئلہ بھی ہو۔ ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' میں ''ہوا'' کا جو کردار ہے وہ نئی غزل میں ایک نئی حسیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے ہوا کے شور کو یوں باندھا ہے۔

گذشتہ رات بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تمھیں صدا دیتے

شہریار نے لفظ ''آندھی'' استعمال کیا ہے۔

ہر شخص مضمحل ہے بکھرنے کے خوف سے
آندھی کا قہر سرو و صنوبر پہ دیکھ کے

ظفر اقبال نے ہوا کی طاقت کو یوں بیان کیا ہے۔

وہ پارہ پارہ کرے اور یہ اڑا لے جائے
جو فرق ہے تو ہوا و ہنر میں اتنا ہے

اب منیر نیازی کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

ازل سے ہے جو سفر میں یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو کہیں ہوا ہی نہ ہو

ازل سے کون سی بلا ہے جو ہم سفر ہے لیکن اس ہم سفر کو کسی نے مجسم شکل میں دیکھا نہیں۔ اس کا خوف بہرحال قائم ہے۔ ''کہیں ہوا ہی نہ ہو'' کا ٹکڑا خوف کی شدت کو مزید نمایاں اور تیز کرتا ہے۔ شعر کی ردیف ''ہی نہ ہو'' گمان اور یقین کی کشمکش کو نہایت ہنرمندی اور دردمندی کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔ ''ہوا'' موت کا استعارہ ہو سکتی ہے۔ پہلے مصرعے میں ''بلا'' کا قافیہ ثانی مصرعے کے ''ہوا'' کو فنا پذیری کی علامت بنا دیتا ہے۔ ورنہ تو ہوا زندگی کی علامت بھی ہے جیسا کہ خود منیر نے ایک شعر میں ہوا کو یوں باندھا ہے۔

ہے ارد گرد گھنا پن مرے درختوں کا
کھلا ہے در کسی دیوار میں ہوا کے لیے

منیر نیازی کے ان دو شعروں میں "ہوا" کا کردار دیکھیے۔

بس ایک ماہِ جنوں خیز کی ضیا کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا
گری ہوئی دیواروں میں جکڑے سے ہوئے دروازوں کی
خاکستر سی دہلیزوں پر سرد ہوا سے ڈرتا ہے

منیر نیازی کی غزل میں جہاں بھی خوف اور زیاں کا احساس شعر کا محرک بنا ہے وہاں معنی اور کیفیت کا خوبصورت امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔

اڑا غبار ہوا سے تو راہ خالی تھی
وہ کون شخص تھا اس میں غبار کس کا تھا

میر کا شعر یاد کیجیے۔

روئے آدم ہی ہے تمام زمیں
پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

میر کی تہذیب کے بارے میں کیا کہا جائے۔ زیب غوری کہتے ہیں۔

ایک جھونکا ہوا کا آیا زیب
اور پھر میں غبار بھی نہ رہا

منیر نیازی کے یہاں موت کا خوف چاہے عصری صورت حال سے جتنا بھی متعلق ہو، بالآخر وہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی اور دائمی المیہ بن جاتا ہے۔ منیر نیازی کے تخلیقی تجربے کا بنیادی حوالہ تو ہجرت ہے لیکن یہاں ہجرت ایک وسیع تر انسانی صورت حال کا حصہ بن جاتی ہے۔ منیر نیازی کے یہاں یہ مضمون بار بار آتا ہے۔ منیر کی بستی اور منیر کا شہر تو سب کو معلوم ہے لیکن جو بستی منیر کے تصور میں آباد ہے اس کے بارے میں آسانی سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ہماری تاریخی و تہذیبی روایت میں وہ سب کچھ شامل ہے جسے ہم مشترکہ تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ منیر اپنے ملک اور اپنی بستی کے تلخ ترین تجربے کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ تجربے ملکی اور جغرافیائی حدود سے نکل کر ہر اس ملک کی کہانی بن جاتے ہیں جو اس تلخ تجربے سے کسی نہ کسی شکل میں گزر رہا ہو۔

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

یہ برہنہ گفتاری منیر کی غزلوں میں کم ہے لیکن یہاں بھی شاعر کی آواز بے قابو نہیں ہوتی۔ میں نے منیر کے سلسلے میں خوف اور زیاں کے احساس کا ذکر کیا ہے۔ یہاں منیر کی دو غزلیں پیش کرتا ہوں جن میں زندگی کی بے معنویت، اس کی لاحاصلی اور دیگر محرومیاں سمٹ آئی ہیں۔

شانِ ہنر، کلامِ سخنور بھی کچھ نہیں
عجزِ فقیر و کبرِ تونگر بھی کچھ نہیں
بنیاد کچھ نہیں ہے کسی شے کی اس جگہ
اس شہر میں بہائے سکندر بھی کچھ نہیں
رشتہ روایتوں سے بھی باقی نہیں رہا
آیندہ کے سفر کے افق پر بھی کچھ نہیں
لاحاصلی ہی شہر کی تقدیر ہے منیر
باہر بھی گھر سے کچھ نہیں اندر بھی کچھ نہیں

جس شہر کا قصہ منیر نے ان شعروں میں پیش کیا ہے وہ تاریخ کا ایک نیا یا انوکھا شہر نہیں ہے، دنیا میں ایسے شہر ہمیشہ آباد ہوتے رہے ہیں۔ ایک تخلیق کار ان حالات میں کیا کچھ محسوس کرتا ہے اور اسے کس طرح فن کا روپ دینا چاہتا ہے یہ معاملہ انفرادی ہے۔ منیر نیازی کے درج بالا اشعار میں معنی کی جہتیں نہیں ہیں لیکن احساس کی شدت ضرور ہے۔

ایک میں اور اتنے لاکھوں سلسلوں کے سامنے
ایک صوتِ گنگ جیسے گنبدوں کے سامنے
مٹتے جاتے نقش، دودِ دم کی آمد رفت سے
کھلتے جاتے بے صدا لب آئینوں کے سامنے
ہے ہوائے سیراب اور اجنبی سی سرزمیں
اڑ رہی ہے خاک کہنہ ساحلوں کے سامنے
دشمنی رسمِ جہاں ہے دوستی حرفِ غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے
چار چپ چیزیں ہیں بحر و بر فلک اور کوہسار
دل دہل جاتا ہے ان خالی جگہوں کے سامنے

اپنی اکیلی ذات کو لاکھوں سلسلوں کے مقابلے میں سینہ سپر دیکھنا اور اسے صوتِ گنگ جیسے گنبدوں سے تشبیہ دینا کسی معمولی شاعر کے بس کا نہیں ہے۔ یہ لاکھوں سلسلے کیا ہیں دراصل یہی وہ اشاروں اور خیالوں کی دنیا ہے جو شعر کے حسن کو دوبالا کرتی ہے اور معنی کے نئے نئے در کھولتی ہے۔ سانس کی آمد و رفت کے دھوئیں سے بے صدا لب کا آئینوں کے سامنے کھلنا بالکل ایک نئی تخلیقی اپج ہے۔ تیسرے شعر میں ہوائے سیر، اجنبی سی سرزمین اور کہنہ ساحلوں پر خاک کا اڑنا ایک صورت حال کا بیان ہے جس کی معنوی دنیا ان تراکیب کی وجہ سے محدود نہیں ہوتی۔ پانچویں شعر میں جرمِ آدم کے قصے کو جس طرح سے دیکھا گیا ہے اس کی مثال نئی غزل میں نایاب ہے۔ پانچویں شعر کا انداز سادہ اور بیانیہ

ہے لیکن چھٹا شعر اپنے بیانیہ اسلوب کے باوجود لفظ چپ کے سبب ایک خاموش مگر دہشت ناک فضا قائم کر دیتا ہے۔ خاموشی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ منیر نیازی نے چار چپ اشیا کو اکٹھا کر کے خاموشی کی طاقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ منیر نیازی کی غزل میں صدا اور آواز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لفظ صدا تو انھوں نے جہاں جس شعر میں بھی استعمال کیا ہے اسے انوکھا اور منفرد بنا دیا ہے۔

ہے باب شہر مردہ گزرگاہِ بادشام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر
بس ایک ہو کا تماشہ تمام سمتوں پر
مری صدا کے سفر میں سراب کیوں آیا
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں
ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح
اک اور شہر بھی ہے قریۂ صدا کے سوا
کوکتی تھی ہنسری چاروں دشاؤں میں منیر
پر نگر میں اس صدا کا راز داں کوئی نہ تھا

منیر نیازی کا شہر اور اس کے شب و روز منیر کی شخصیت میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ شاعری زندگی کی اس بے معنویت اور لاحاصلی کو بھی پیش کرتی ہے جو نئی شاعری کی ایک شناخت ہے اور ساتھ ہی اس میں وہ غم و غصہ کی وہ تہ نشیں لہریں بھی ہیں جو قاری کے اندر آہستہ آہستہ ظلم و جبر کے خلاف نفرت کا احساس جگاتی ہیں۔ منیر نیازی کی شاعری ایک امتحان بھی ہے کہ تجربات چاہے جتنے بھی تلخ ہوں انھیں اول و آخر شاعری ہی ہونا چاہیے۔ منیر نیازی اپنے شہر کے ظالموں کو دیکھتے ہوئے تاریخ میں بہت دور تک نکل جاتے ہیں اور انھیں ظلم و جبر کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں کی غزل میں منیر نیازی کی غزل اپنے سماجی سروکار کو جس انفرادی شکل اور توانا اسلوب میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئی، اس میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ جہاں گفتگو کا انداز سیدھا اور سادہ ہے وہاں ان کی دردمندی اور دل سوزی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ منیر کی غزلوں گوئی کا ایک اہم حصہ ایک ظالم و جابر شہر کے نظام سے وابستہ ہے۔

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
کر یاد ان دنوں کو، کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں، جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا
راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا
شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا
شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیر
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

منیر نیازی کے ان شعروں میں کوئی پیچیدہ بیانی نہیں، لیکن یہ منیر کی غزل کا ایک ایسا رنگ ہے جس کو نظر انداز کر کے منیر کی پیچیدہ بیانی پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔ منیر کی ان سادہ اور مسلسل غزلوں میں جو آگہی سمٹ آئی ہے اس سے بھی منیر کی تخلیقیت کا پتا چلتا ہے۔

منیر نیازی کے بارے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے اور صحیح بھی ہے کہ ان کے یہاں ہجرت کا تجربہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس تعلق سے وہ آفت زدہ شہر سے اپنی شعری کائنات کو سجاتے ہیں لیکن منیر کی غزل میں ہمیں ایک ایسے شاعر کا تخلیقی ذہن بھی ملتا ہے جو حیات و کائنات کے مسئلے پر سوچتے ہوئے تضاد اور انتشار کا شکار بھی ہوتا ہے اور وہ فطری طور پر وہی انداز اختیار کرتا ہے جو غالب کی اس غزل میں ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اب منیر نیازی کی غزل دیکھیے۔

یہ آنکھ کیوں ہے، یہ ہات کیا ہے
یہ دن ہے کیا چیز، رات کیا ہے
فراقِ خورشید و ماہ کیوں ہے
یہ ان کا اور میرا ساتھ کیا ہے
گماں ہے کیا اس صنم کدے پر
خیالِ مرگ و حیات کیا ہے
فغاں ہے کس کے لیے دلوں میں
خروشِ دریائے ذات کیا ہے

فلک ہے کیوں قید مستقل میں
زمیں پہ حرف نجات کیا ہے
ہے لمس کیوں رائیگاں ہمیشہ
فنا میں خوف ثبات کیا ہے
منیر اس شہر غم زدہ پر
ترا یہ سحر نشاط کیا ہے

منیر نیازی کی غزل میں جنگل اور شام کے استعارے خاص طور پر متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں بے امانی اور خوف کے احساس کی مختلف جہات ہیں لیکن جب وہ شام اور جنگل کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں تو اس کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے جنگل اور شام میں ایک تعلق بھی ہے۔ دن کے کسی حصے میں جنگل جائیے شام کا گمان ہوتا ہے جنگل کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ نئے شعراء نے وجود کو جنگل سے بھی تشبیہ دی ہے۔ جنگل کا بھید اس کی خاموشی میں پوشیدہ ہے لیکن اس خاموش فضا کو جب کوئی آواز توڑتی ہے تو مسافر اس پر کان دھرتا ہے۔ منیر کا خیال ہے۔

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھیو

یہاں بھی خوف غالب ہے جس کی تشریح و تفہیم میں کچھ باتیں کی جاسکتی ہیں لیکن اس خوف سے جو مجموعی صورت حال سامنے آتی ہے اسے کسی موضوع یا عنوان کے تحت پیش نہیں کیا جاسکتا اور لازماً ہمارا ذہن جنگلوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ ''انسانی زندگی کا سفر'' کہنے کو یہ ایک سادہ سا عنوان ہے لیکن ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اس کو کس کس طرح دیکھا، برتا اور محسوس کیا ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ سفر کی پوری روداد کبھی کبھی دو مصرعوں میں بند ہوجاتی ہے اور اس میں تمام سچائیاں سمٹ آتی ہیں۔ میر کا مشہور شعر ہے:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

منیر نیازی سفر میں اسباب کے لٹنے کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں سفر کا خوف اور زیاں کا احساس غالب ہے۔

جب سفر سے لوٹ کر آئے تو کتنا دکھ ہوا
اس پرانے بام پر وہ صورت زیبا نہ تھی

یہاں منیر سفر سے واپسی کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن یہ سفر اس سفر سے بہت مختلف ہے جسے ہم انسانی زندگی کے مجموعی سیاق میں دیکھتے ہیں۔ منیر جنگل کے سفر کو جس قدر پیچیدہ بنا دیتے ہیں وہ جنگل کا تقاضا بھی ہے۔ ناصر کاظمی کے یہاں جنگل کی یہ پیچیدگی نظر نہیں آتی:

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

''جنگل میں شام کا ہونا'' اس سے منیر نے تخلیقی سطح پر بڑے کام لیے ہیں۔ ایک طرف سورج غروب ہورہا ہے اور شفق کی لالی فضا کو رنگین کررہی ہے دوسری طرف شام کی تاریکی بھی رفتہ رفتہ اپنی چادر پھیلا رہی ہے۔ شفق کے لال رنگ سے منیر کی دلچسپی دراصل اسی جنگل کے سفر کی دین ہے۔ یہ رنگ منیر کو کبھی اچھا لگتا ہے تو کبھی اسے دیکھ کر ان کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شام کی اس فضا کو دوسرے شعراء نے تخلیقی سطح پر نہ برتا ہو لیکن منیر نے اس کے اظہار میں بڑا حسن پیدا کیا ہے۔

ہوائے شام کے رنگیں دیار جلنے لگے
ہوئی جو شام تو جھکڑ عجیب چلنے لگے
تھی شام زہر رنگ میں ڈوبی ہوئی کھڑی
پھر اک ذرا سی دیر میں منظر بدل گیا
یاد بھی ہیں اے منیر اس شام کی تنہائیاں
ایک میداں اک درخت اور تو خدا کے سامنے
شفق کا رنگ جھلکتا تھا لال شیشوں میں
تمام اجڑا مکاں شام کی پناہ میں تھا
شام کے رنگوں میں رکھ کر صاف پانی کا گلاس
آب سادہ کو حریف رنگ بادہ کردیا

یہ سارے بیانات ذاتی تجربات و احساسات کا پتا دیتے ہیں۔ ایک وجودی احساس ہی ان شعروں کو تخلیقی قوت عطا کرتا ہے۔ ان شعروں میں صورت حال کی پیش کش کہیں دھندلی ہے تو کہیں کچھ واضح۔ اگر نئی غزل کے نمایاں رنگوں کو سامنے رکھ کر منیر کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو صرف منیر کی غزل سے مخصوص ہے۔ تنہائی، لاحاصلی، خوف اور زیاں کے احساسات منیر کی غزل میں انسانی زندگی کا مقدر بن جاتے ہیں۔ منیر نیازی کے گھنے اور گہرے تجربے کی طلسماتی دنیا ہمیں نئی غزل کا ایک باذوق اور سنجیدہ قاری بناتی ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

تحریر: مہیپ سنگھ
ترجمہ: خورشید عالم

(ہندی کہانی)

سہمے ہوئے

ہاشمی کے ٹھیک سامنے ہرجیت بیٹھتا ہے۔ ہرجیت کی داہنی طرف لوبو اور بائیں جانب شرما۔ ورما کے بیٹھنے کی جگہ تعین نہیں ہے۔ وہ کبھی شرما کے بائیں جانب بیٹھتا ہے کبھی لوبو کے داہنی طرف۔

دفتر کی یہ چوکڑی نہیں پنج کڑی ہے۔ جناب اقبال ہاشمی، سردار ہرجیت سنگھ، مسٹر جان لوبو، پنڈت رگھوناتھ شرما اور شری بی.آر. ورما، لیکن یہ بی.آر. کیا ہوا؟ جب سبھی کے نام پورے ہیں تو ورما کے ہی مخفف کیوں؟ یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا، ورما خود کو بی.آر. ورما ہی کہلانا پسند کرتا ہے۔

جب پانچوں افراد اپنے اپنے لنچ باکس کھول لیتے ہیں تو کسی نہ کسی بات کو لے کر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ جان لوبو یہ کہہ کر بھی اپنی بات شروع کر سکتا ہے، "یار ورما، تم نہ بی.آر. ہو نہ ورما، تم ہو بدھ رام کوری۔ کوری ہونے سے تم شیڈولڈ کاسٹ میں آ گئے اور آج کل تو شیڈولڈ کاسٹ کی چاندی ہی چاندی ہے لیکن یار تم بی.آر. ورما کے نقاب کے پیچھے اپنی اصلیت کتنے دن چھپاتے رہوگے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم کھل کر کہتے کیوں نہیں کہ میں کوری ہوں...... اینڈ آئی ایم پراؤڈ آف اٹ....."

بس یوں سمجھیے کہ لنچ کا پورا وقت اسی بحث میں نکل جاتا ہے۔ ورما آریوں اور اناریوں کی پوری تاریخ کو انھی منٹوں میں اپنے سبزی کے پیالے میں سمیٹ لیتا ہے۔ طبقاتی نظام کے نام پر کچھ لوگوں کو اچھوت بنا دیے جانے کی سازش پر پوری تقریر کر ڈالتا ہے اور کہتا ہے، "میں تو بی.آر. ورما ہی لکھتا ہوں۔ میرا بیٹا سیدھے سیدھے اپنے آپ کو برہمہ کمار شرما لکھے گا۔" یہ کہہ کر وہ رگھوناتھ شرما کی جانب مڑتا ہے اور مسکراتا ہے۔

محفل برخواست ہو جاتی ہے۔ ہاشمی اپنی میز کی دراز سے سپاری، الائچی نکال کر سب کو دیتا ہے اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر چلے جاتے ہیں۔

اس پنج کڑی میں ایک ہندو، ایک مسلمان، ایک عیسائی، ایک سکھ اور ایک ہریجن ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ کوئی ملک کی جذباتی ایکتا بڑھانے والا دفتر ہے۔ اسے بس ایک اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے ایک اور بات یاد آتی ہے۔ آپ نے نئی دہلی کی بینک وین ڈکیتی کی بات نہیں بھولی ہوگی۔ چاروں نوجوانوں نے مل کر دن دہاڑے ایک بینک کی موٹر گاڑی کو لوٹ لیا تھا، خزانچی اور ڈرائیور نوجوانوں کی گولی کے شکار ہو گئے تھے۔ طویل عرصے تک اس ڈکیتی کا سراغ نہیں ملا اور جب چاروں نوجوان پکڑے گئے تو پتہ چلا کہ وہ جذباتی ایکتا کی خاصی ترجمانی کرتے تھے۔ ان میں دو ہندو تھے ایک مسلمان اور ایک سکھ۔

یہ دفتر کتابیں شائع کرنے کا ایک بڑا ادارہ ہے۔ اس کا صدر دفتر بمبئی میں ہے۔ شمالی مغربی حصے کا دفتر دہلی میں ہے۔ یہ ادارہ مختلف زبانوں میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ ہر زبان کے اپنے اپنے ایڈیٹر ہیں۔ پنڈت رگھوناتھ شرما ہندی کے، جناب اقبال ہاشمی اردو، سردار ہرجیت سنگھ پنجابی اور مسٹر جان لوبو انگریزی کے مدیر ہیں۔ پہلے یہ ادارہ ایک برٹش فورم کا حصہ تھا۔ اب اس پر پوری طرح ہندوستانیوں کا قبضہ ہے۔ لیکن برٹش لوگوں نے اس ادارے میں جو روایتیں قائم کی تھیں، آج کے مالک بھی اسے پوری طرح سے نبھائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی شاید اسی روایت کا حصہ ہے کہ مالک لوگ سمجھتے ہیں کہ سنسکرت ہندی کا کام کوئی برہمن ہی ٹھیک ڈھنگ سے کر سکتا ہے، اردو کا کوئی مسلمان ہی کر سکتا ہے، پنجابی کے لیے ایک سکھ ہونا چاہیے اور انگریزی کسی خالص ہندوستانی کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے برٹش فرد ہونا چاہیے۔ وہ نہ ہو تو اینگلو انڈین ہو، اور وہ بھی نہ ہو تو کم از کم کرسچین تو ہونا ہی چاہیے۔

ایک تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ پہلے ہندی کا سمپادک گانٹھ لگی چوٹی والا، دھوتی کرتا دھاری، تلک دھاری پنڈت ہوتا تھا۔ اسی طرح اردو کا مدیر 'مولوی نما' اور پنجابی والا 'گیانی نما' ہوتا تھا۔ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب لوگ کافی فراخ دل ہو گئے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ شرما، ہاشمی اور لوبو کی شکل دیکھ کر انھیں ہندو، مسلمان اور عیسائی بتایا جا سکتا ہے۔ ہرجیت کی تو بات ہی الگ ہے۔ اس کی مہرون رنگ کی پگڑی اس کے 'خالصہ' ہونے کا اعلان کرتی رہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ پانچوں لوگ فراخ دل ہیں۔ ان کی فراخ دلی کا اس سے بڑا

ثبوت اور کیا ہوگا کہ یہ پانچوں دوست ہیں اور ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں۔ چائے وائے ساتھ پیتے ہیں۔ یہ لوگ باقاعدہ ہاشمی کی میز پر اپنے لنچ بکس کھولتے ہیں۔ یہ کیفیت بھی کچھ کم خوشنما نہیں۔ شرما دوسروں کے لنچ بکس میں سے اچار اور سلاد، کھیرا، گاجر، مولی، پیاز وغیرہ لے لیتا ہے۔ ہاشمی کے لنچ بکس میں اکثر کباب ہوتے ہیں اور ہرجیت کے ٹفن میں تلی ہوئی کلیجیاں۔ ہاشمی ہرجیت کی کلیجیاں کھالیتا ہے اور ہرجیت ہاشمی کے کباب کھا جاتا ہے۔ یہاں دونوں اپنے اپنے مذہبی فرمانوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں کیونکہ ہاشمی کے کباب ذبح کیے گئے بکرے کے گوشت کے ہوتے ہیں اور سکھوں میں حلال کھانا منع ہے۔ اسی طرح ہرجیت کی کلیجیاں جھٹکا کیے ہوئے بکرے کی ہوتی ہیں جسے ایک مسلمان نہیں کھا سکتا۔ کھان پان کے اس کھلے پن کے باوجود ہاشمی اور ہرجیت کے ذہنوں میں ایک شک ہمیشہ ابھرتا رہتا ہے۔ ہرجیت حلال بکرے کے کباب کھانے جتنا فراخ دل تو ہوگیا ہے لیکن بیف نہیں کھا سکتا۔ اس لیے وہ کبھی کبھی ہاشمی سے کہہ دیتا ہے یار ہاشمی، تیرے کباب اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ میں انھیں چھوڑ نہیں سکتا لیکن کبھی مجھے بیف کھلا کر میرا دھرم بھرشٹ نہ کرنا۔''

اسی طرح سے ہاشمی بھی ایک بات سے پوری طرح محتاط ہے۔ وہ ہرجیت کے لنچ باکس کی کلیجی کھالیتا ہے کیونکہ بکرے کی کلیجی کا ذائقہ اسے حلال یا جھٹکا کیے جانے سے نہیں روکتا، لیکن وہ 'پورک' نہیں کھا سکتا۔ وہ اکثر کہہ دیتا ہے، سور کا گوشت کوئی انسانوں کے کھانے کی چیز ہے ...لاحول ولاقوۃ.....''

لوبو اور ورما نے کھانے پینے کے معاملے میں کبھی محبت نہیں کی۔ لوبو سب کچھ کھالیتا ہے۔ ویسے اس کا لنچ باکس صرف اسی کا رہتا ہے کیونکہ اس میں کبھی ٹماٹر والی، کبھی 'چیز' والی اور کبھی کبھی 'ہیم' والی سینڈوچ ہوتی ہیں۔ ورما کو دوسروں کے لنچ بکس سے کچھ بھی لیتے ہوئے جھجک ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ سلاد خوب لاتا ہے اور ایک اخباری کاغذ پر رکھ کر میز کے درمیان میں رکھ دیتا ہے۔ سب وہیں سے لے کر کھاتے رہتے ہیں۔

ہاشمی اور ہرجیت کبھی کبھی اپنے لنچ بکس سے کباب یا کلیجی نکال کر اس کے لنچ بکس میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک دن ہرجیت نے کہا،'' یار ہاشمی، آج پھر اخبار میں خبر آئی ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ سنیوں میں جھگڑا ہوگیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شیعہ، سنیوں میں آخر جھگڑا کس بات کا ہے؟''

خبر صبح کے اخبار میں تھی اور سب نے پڑھی تھی۔ اس سے قبل بھی اس لنچ کڑی میں اس موضوع پر کتنی گفتگو ہو چکی تھی، کیونکہ سال میں دو ایک بار تو ایسی خبر اخباروں میں آتی ہی ہے۔ ہاشمی نے کئی بار اس کا پس منظر بتایا ہے، لیکن وہ کسی کو یاد نہیں رہتا۔ جب بھی اخبار میں یہ خبر چھپتی ہے یہ بات نئے سرے سے شروع ہوتی ہے۔

آج ہاشمی نے جواب نہیں دیا، بلکہ سوال کیا،'' تم یہ بتاؤ کہ یہ اکالیوں اور نرنکاریوں کا جھگڑا کیا ہے؟ اس فساد میں کچھ ہی عرصے میں کتنے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔''

شرما، ورما، لوبو، سبھی ہرجیت کی طرف دیکھنے لگے۔ ان دنوں اکالی نرنکاری فساد کی خبریں اخباروں کی سرخی بنی ہوئی تھیں۔ ہرجیت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اتنی دیر میں کیا کہے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا،'' اس جھگڑے کا پس منظر ذرا طویل ہے۔ میں کسی دن تفصیل سے بتاؤں گا۔''

شرما ایسے اختلافات میں بہت دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ لوگوں کی باتیں سنتا ہے اور اپنا سارا ردعمل آنکھوں، ابروؤں، چہرے کی لکیروں اور گردن کو آگے پیچھے یا ادھر ادھر ہلانے سے ہی ظاہر کرتا ہے۔

وہ بولا،'' ہرجیت ٹھیک کہتا ہے، جھگڑوں کے بیج ہمارے پس منظر میں پتہ نہیں کب، کس نے، کیوں بو دیے تھے۔ اس بوئی ہوئی فصل کو ہم سب سے کاٹ رہے ہیں۔ کاٹتے چلے جائیں گے۔ انسان ضرور لڑے گا۔ وہ تنہا لڑتا ہے تو لوگ اسے جھگڑالو، غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں۔ وہ گروہ بنا کر لڑتا ہے تو دیش بھگت، مجاہد اور غازی کہلاتا ہے، اسے اعزاز بخشا جاتا ہے۔ آخر انسان یہ اعزاز کیوں نہ لے؟''

'' جی ہاں، اسی اعزاز کے لیے وہ اجتماعی طور پر نفرت کرتا ہے۔ فرد سے نہیں بلکہ ایک پورے گروپ سے، اسے گاؤں میں بسنے نہیں دیتا، کنویں سے پانی نہیں بھرنے دیتا، مندر میں نہیں جانے دیتا، اس کا فقط سایہ پڑ جانے سے ناپاک ہو جاتا ہے۔'' ورما اکثر بات کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہے۔

ان دنوں کے اخبار فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے پر ہیں۔ مرادآباد کی عیدگاہ میں سور داخل ہو گیا تھا، بنارس کے کسی مندر میں گائے کا گوشت ملا تھا۔ الہ آباد کی ایک مسجد میں سور کا گوشت پایا گیا تھا۔ دہلی میں بھی چھٹ پٹ واردات ہوئی ہیں۔ ہاشمی بلیماران میں رہتا ہے۔ وہاں کرفیو لگا ہے۔ ہرجیت ترکمان گیٹ میں رہتا ہے۔ وہاں بھی کرفیو لگا ہے۔ صرف لوبو اور ورما دفتر آرہے ہیں۔ شرما کچھ دنوں کے لیے چندوسی اپنے بھائی سے ملنے گیا تھا۔

اس علاقے میں فساد کچھ اس طرح برپا ہے کہ وہاں سے اس کی کوئی خبر ہی نہیں آرہی ہے۔

ہرجیت کتنے ہی سالوں سے روز شام کسی بھی وقت شیش گنج گردوارے میں ماتھا ٹیکنے ضرور جاتا ہے۔ 1947 میں جب اس کے ماں باپ، بڑے بھائی بہن گوجرانوالہ سے اجڑ کر دہلی آئے تھے تو وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھا۔ اس کی ماں کتنے دہشت زدہ دن اور کتنی خوفناک راتوں کو اپنی کوکھ میں سمیٹے ہوئے دہلی پہنچی تھی۔ اس کے خاندان نے کتنے دن ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے اور شیش گنج گردوارے میں لنگر کھاتے ہوئے گزارے تھے۔ بعد میں اس کے باپ نے ترکمان گیٹ میں ایک مکان خرید لیا تھا جس کا مسلمان مالک پاکستان جانے کی عجلت میں کوڑیوں کے مول بیچ رہا تھا۔ تب سے اس کا خاندان اسی مکان میں ہے۔ اس مکان کا پورا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ اس کے باپ اور بھائیوں نے مل کر رفتہ رفتہ اسے ایک اچھی خاصی کوٹھی میں تبدیل کر دیا ہے، لیکن اس علاقے میں آج بھی مسلمانوں کی کثرت ہے۔ 'سرداروں' کے خاندانوں کی گلی محلے میں بڑی عزت ہے لیکن جب بھی ملک کے کسی حصے میں فسادات کی خبریں آتی ہیں دل کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا خوف ان کے چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے۔

جب بھی فساد کی خبر شدت اختیار کرتی ہے، ہرجیت اپنی بشرٹ کے نیچے چھوٹی کرپان پہننا شروع کر دیتا ہے۔

ہاشمی الہٰ آباد کا رہنے والا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت اس کی عمر تقریباً تین چار سال کی تھی۔ اس کے کئی قریبی رشتہ دار پاکستان میں رہتے ہیں جو تقسیم کے وقت ادھر چلے گئے تھے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم.اے. کرنے کے بعد وہ نوکری کی تلاش میں دہلی آیا۔ برسوں چھوٹے موٹے اردو اخباروں میں نوکری کرنے کے بعد اسے اس اشاعتی ادارے میں اچھی نوکری ملی۔ برسوں سے وہ بلیماران کی بدبودار گلیوں کے گوداموں جیسے دو کمروں کے سیلن بھرے مکان میں رہتا ہے۔ کتنی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی دہلی کے کسی پوش علاقے میں ایک فلیٹ لے کر رہے۔ اس کے بچے کسی اچھے پبلک اسکول میں پڑھیں۔ اس کی بیوی ان گلیوں کا پان کھاتی، پھوہڑ باتیں کرتی اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے زندگی جیتی عورتوں سے الگ ہو کر زندگی جیے لیکن وہ اسی گلی میں زندگی گزارے جا رہا ہے۔ یہاں وہ خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔ اسے بار بار لگتا ہے اگر وہ گرین پارک، حوض خاص، ساؤتھ ایکسٹنشن یا لاجپت نگر جیسی کالونی میں جہاں سے اس کا دفتر بہت قریب ہے، مکان لے کر رہے گا تو اس کے ہندو، سکھ پڑوسی کبھی اس سے کھل کر برتاؤ نہیں کریں گے۔

آج کئی دن بعد یہ بیچ کڑی پھر جمع ہے۔ شرما چندوسی سے واپس آگیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک کھنچاؤ سا ہے۔ لوبو پوچھتا ہے،" اس طرف کیا حال ہے؟"" حال کیا ہوتا ہے؟" شرما کھڑائی آواز میں کہتا ہے،" پاکستان بن گیا لیکن پاکستان زندہ باد کے نعرے اب بھی اسی طرح لگ رہے ہیں جیسے ابھی ایک اور پاکستان بننا ہے۔ مسجدیں گولا بارود اور چاقو چھروں کی گودام بنی ہیں۔ پاکستانی ایجنٹ سرِ عام فساد کرا رہے ہیں۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ پناہ انھیں یہاں کے مسلمانوں سے مل رہی ہے۔ فسادی کھل کر پولس اور فوج پر حملے کر رہے ہیں اور اس میں مشین گنوں اور آٹومیٹک رائفلوں کا استعمال ہو رہا ہے...... یہ اسلحے انھیں کہاں سے مل رہے ہیں؟"

شرما کی باتوں سے ایک عجیب سا سناٹا چھا جاتا ہے۔ شرما، ہرجیت، لوبو سبھی کنکھیوں سے ہاشمی کی طرف دیکھتے ہیں جیسے جو کچھ شرما نے کہا ہے اس کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہاشمی کے سر بھی ہے۔

ہاشمی کچھ نہیں بولتا۔ چپ چاپ کھانا کھاتا رہتا ہے۔

ورما کہتا ہے،" یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ ہریجن ہر طرف سے پٹتے ہیں۔ مراٹھواڑہ میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھوں پٹ رہے ہیں کیونکہ اچھوت ہیں۔ مرادآباد علاقے میں مسلمانوں نے ہریجن بستیاں جلا دی ہیں، کیونکہ ان کی نگاہ میں ہم ہندو ہیں۔"

لوبو کہتا ہے،" ہم سب لوگوں نے وہ خبر تو پڑھی ہوگی...... آسام میں کچھ ایشور کے بھگتوں نے ایک پولس انسپکٹر کو پکڑ کر اس قدر مارا کہ وہ وہیں مر گیا۔" سبھی لوبو کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

"کیسی جہالت ہے؟" لوبو جیسے خود کلامی کرتا ہے،" ایک مسلمان پولس سب انسپکٹر اپنے ایک ہندو ساتھی کو ڈھونڈتا ہوا مندر کے احاطے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا...... ارے یہ تو مسلمان ہے...... پھر اتنا پیٹا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔"

سبھی شرما کی طرف دیکھتے ہیں، جیسے وہ مسلمان سب انسپکٹر کیوں مارا گیا۔ اس کی وضاحت شرما کریں گے۔

آج ورما کا لایا ہوا سلاد بچ جاتا ہے کیونکہ شاید کبھی نے اس میں سے مولی یا پیاز کے ٹکڑے نہیں اٹھائے تھے۔ آج یہ بھی ہوا کہ ہاشمی نے اپنے کباب اور ہرجیت نے اپنی مچھلیاں خود ہی کھائیں۔

آج کل ہاشمی اور ہرجیت کچھ زیادہ ہی قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ترکمان

گیٹ اور بلیماران کے علاقے بھی پاس پاس ہیں۔ اکثر دونوں شام کو ساتھ ساتھ لوٹتے ہیں۔ لال قلعہ پر بس سے اتر کر دونوں چاندنی چوک کی طرف چل دیتے ہیں۔ ہرجیت شیش گنج گردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لیے رک جاتا ہے۔ ہاشمی آگے چلا جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں تو ایک دوسرے کا سہارا محسوس کرتے ہیں۔

ہاشمی کہتا ہے، ''کسی بھی ملک میں اقلیتوں کی زندگی محفوظ نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کب اکثریت میں کسی بھی باعث پاگل پن سوار ہو جائے اور وہ کسی بھی اقلیت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں۔''

ہرجیت اس بات کی تائید کرتا ہے، ''کم گنتی والے کمیونٹی کے آدمی کو تو ایک اچھی نوکری بھی نہیں ملتی۔ مجھے پتہ ہے اس نوکری کو پانے کے لیے کتنے دھکے کھانے پڑے۔''

اس دن لنچ کے بعد ہاشمی نے ہرجیت کو اپنے کمرے میں بلایا۔

''لوبو''، ہرجیت نے دیکھا۔ ہاشمی کچھ گھبرایا ہوا ہے۔

''گاؤں سے والد صاحب کا خط آیا ہے۔ اماں بہت بیمار ہے...... بس آخری وقت سمجھو۔ مرنے سے قبل ایک نظر مجھے دیکھنا چاہتی ہیں۔ سوچتا ہوں دو چار دن کے لیے چلا جاؤں۔''

''ہاں...... ہاں......؟ آؤ۔ اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے۔ تمھاری چھٹی تو باقی ہوگی؟''

''چھٹی کی تو کوئی بات نہیں ہے، لیکن یار...... چاروں طرف فساد کی آگ لگی ہے۔'' ہاشمی کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

''ہاں، فساد تو ہیں، لیکن ایسی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل حالات بہتر ہیں اور اب تو فساد زدہ علاقے میں فوج تعینات ہے۔'' ہرجیت بولا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے،'' ہاشمی کچھ رک رک کر بولا، ''لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ لوگ راستے میں ٹرین روک لیتے ہیں اور بس پھر کاٹ پیٹ شروع کر دیتے ہیں۔''

ہرجیت نے دیکھا، ہاشمی کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئی ہیں۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس درمیان فسادیوں نے کہیں ٹرین روک کر کاٹ پیٹ کی؟ ایسی کوئی خبر بھی نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، رات کی گاڑی سے سفر مت کرو۔ تمھیں الٰہ آباد جانا ہی ہے نا، کالکا میل سے چلے جاؤ۔ گاڑی صبح چلتی ہے، تم دن ہی دن میں الٰہ آباد پہنچ جاؤ گے۔''

ہرجیت کی بات سن کر ہاشمی کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا، ''اس میں ایک اور الجھن ہے۔ ہمارا گاؤں الٰہ آباد سے تقریباً بیس میل دور ہے۔ وہاں بس سے جانا پڑتا ہے۔ الٰہ آباد کی حالت تو تم جانتے ہی ہو۔ بس اڈے تک پہنچتے پہنچتے کسی نے چھرا گھونپ دیا تو اپن گئے کام سے۔''

دونوں سوچ میں پڑ گئے اور کافی دیر تک سوچتے رہے۔ ہاشمی گاؤں نہیں گیا۔ پچ کڑی میں اس سے کسی نے نہیں پوچھا کہ اس کی ماں کی حالت کیسی ہے۔ یہ پوچھتے ہوئے جیسے سبھی کو اندر ہی اندر ڈر لگ رہا تھا۔

لنچ کے وقت کھانا تو سب کا ساتھ ساتھ چل رہا ہے، جگہ بھی وہی ہے، کھانا بھی پہلے جیسا ہی ہے، لیکن پتہ نہیں کیوں ایک دوسرے کے لنچ باکس سے چیزیں لینا لگ بھگ بند سا ہو گیا ہے۔ ورما اپنی سلاد ضرور اسی طرح لاتا ہے اور کاغذ پر پھیلا کر میز کے بیچوں بیچ رکھ دیتا ہے۔ لوگ اس میں سے ایک آدھ ٹکڑا اٹھا لیتے ہیں لیکن کھانا سبھی اپنے اپنے لنچ بکس سے ہی کھاتے رہتے ہیں، جیسے دوسرے کے کھانے میں زہر ملا ہوا ہو۔

اب پہلے جتنی بات چیت بھی نہیں ہوتی۔ ایک خاموشی سی چھائی رہتی ہے۔ اس چپی کو اکثر لوبو ہی توڑتا ہے، یار، ہندو، مسلمانوں کے دنگوں میں ہم عیسائیوں کی مصیبت ہوتی ہے۔ مسلمان ہمیں ہندو سمجھ کر چھرا گھونپ دیتا ہے اور ہندو ہمیں مسلمان سمجھ کر ہماری گردن کاٹ دیتا ہے۔ جب تک ہم بتائیں کہ ہم کیا ہیں پیٹ چاک ہو چکا ہوتا ہے۔''

اس کی اس بات پر ایسا قہقہہ لگا کہ پورا کمرہ گونجنے لگتا ہے۔

پٹنہ میں ہونے والے کتاب میلہ کی تاریخ نزدیک آگئی ہے۔ اس اشاعتی ادارے نے اس نمائش میں اپنے لیے کافی بڑی جگہ لی ہے۔ ورما چونکہ سیلز سیکشن میں ہے، اس لیے وہ ایک ہفتہ پہلے ہی وہاں چلا گیا تھا۔ شرما، ہاشمی، ہرجیت، لوبو کو بھی وہاں جانے کا حکم ہوا ہے۔ 'اپر انڈیا' ایکسپریس میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سبھی کا ریزرویشن ہو چکا ہے۔ چاروں کی برتھ ایک ہی کیبن میں ہے۔ اس لیے سبھی کو اطمینان ہے۔ رات کو خوب موج رہے گی۔ ہرجیت نے سب سے کہہ دیا ہے، ''دوستو گھر سے کھانا کھا کر مت آنا۔ اپنا اپنا کھانا ساتھ لے آنا۔ آٹھ بج کر دس منٹ پر گاڑی چھوٹتی ہے۔ غازی آباد نکل جانے کے بعد جشنِ جمہوریت شروع کریں گے۔ بوتل لوبو لائے گا۔ سلاد ماسٹر ورما ساتھ نہیں ہے، کوئی بات نہیں، شرما جی سلاد آپ لائیں گے۔ ہاشمی، دیکھ یار کباب کافی مقدار میں ہونے چاہیے...... اور ہرجیت سنگھ لائے گا کم از کم آدھا کلو تلی ہوئی کلیجی۔''

آج کا اخبار دنگے فساد کی خبروں سے بھر بھر گیا ہے۔ علی گڑھ میں

چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگ گیا ہے۔ سارے شہر میں فوج گشت کر رہی ہے۔ فسادیوں نے کتنے ہی دکان مکان جلا کر خاک کر دیے ہیں۔ کتنی ہی لاشیں جلے ہوئے مکانوں کے ملبوں کے نیچے سے نکالی گئی ہیں۔ سارا شہر وحشت میں ڈوبا ہوا ہے۔

اسٹیشن پر سب سے پہلے شرما پہنچ جاتا ہے۔ کچھ دیر میں ہاشمی پہنچتا ہے۔ دونوں اپنے کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ شرما کہتا ہے، ''یہ بک فیئر کامیاب نہیں ہوگا۔ ویسے ہی آج کل کتابیں کون خریدتا ہے اور آج کل تو عام آدمی ویسے ہی گھر سے نکلنے سے ڈرتا ہے۔''

ہاشمی سگریٹ سلگا کر پینے لگتا ہے۔ بیٹھے ہوئے بار بار اس کی نظر پلیٹ فارم پر جاتی ہے۔ آج زیادہ بھیڑ نہیں ہے۔ وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا ہے اور بے ساختہ ان میں ہندو اور مسلمان چہرے ڈھونڈنے لگتا ہے۔

لوبو اور ہرجیت ایک ساتھ آتے ہیں۔ چاروں آگئے ہیں اس پر سبھی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ لوبو کہتا ہے، ''گھر سے اسٹیشن تک آتے ہوئے لگا جیسے مجھے سیلوٹ مارنے کے لیے جگہ جگہ پر سپاہی طعینات ہیں۔ لاجپت نگر سے کوئی اسکوٹر والا آنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سب کہتے تھے ادھر کرفیو لگا ہوا ہے۔''

گاڑی چلنے میں ابھی دس پندرہ منٹ باقی ہیں۔ ہرجیت پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ پلیٹ فارم پر روشنی بہت مدھم ہے اور حبس بہت زیادہ۔

گارڈ کی سیٹی سنائی دیتی ہے تو وہ اپنی کیبن میں آکر ہاشمی کے بغل میں بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں خاموش بیٹھے ہیں۔ علی گڑھ کے فساد کی خبر آج کی سب سے تازہ خبر ہے۔ شام کے اخبار میں خبر ہے کہ آس پاس کے اضلاع میں بھی تناؤ بڑھ گیا ہے۔

ہرجیت کہتا ہے، ''کل علی گڑھ میں فسادی ایک مکان میں گھس گئے۔ گھر میں اس وقت ایک ستر سال کا بوڑھا تھا اور ایک آٹھ سال کی لڑکی تھی۔ فسادیوں نے دونوں کو چھرے سے گود گود کر مار ڈالا۔ پتاجی بتاتے ہیں کہ سنہ 47 کے فساد میں فسادی چھوٹے چھوٹے بچوں کو نیزوں کی نوک پر اچھال دیتے تھے...... کیا وہی دن واپس آ رہے ہیں؟''

ایسا لگا جیسے سبھی کے چہرے پر پسینے کی بوندیں جھلک آئی ہیں۔

گاڑی چل دیتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل آتی ہے۔ جمنا کے پل پر گاڑی آتی ہے تو ہاشمی اٹھ کر کیبن کا دروازہ بند کر چٹخنی لگا دیتا ہے۔ پھر سبھی کچھ نہ کچھ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

کسی نے کیبن کے دروازے پر دستک دی ہے۔ لوبو دروازہ کھولتا ہے۔

کنڈکٹر آکر ٹکٹ چیک کرتا ہے اور پوچھتا ہے، ''آپ لوگ بیڈنگ کہاں لیں گے؟''

''کانپور میں!'' لوبو کہتا ہے۔

''نہیں!'' ہرجیت کہتا ہے، ''یہ گاڑی تو صبح چار بجے ہی پہنچ جاتی ہے..... چائے فتح پور میں بھجوایئے گا۔''

''ٹھیک ہے صاحب!'' کہہ کر کنڈکٹر کیبن سے باہر نکل جاتا ہے اور دروازہ بند کرتا جاتا ہے۔''

ہاشمی اٹھتا ہے اور دروازے کی چٹخنی لگا دیتا ہے۔

غازی آباد کے پلیٹ فارم کو چھوڑ کر گاڑی آگے بڑھتی ہے تو لوبو اپنے بیگ سے بوتل نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے، ''بڑی مشکل سے آج اس کا انتظام ہو سکا ہے۔ مجھے دھیان نہیں تھا کہ آج 'ڈرائی ڈے' ہے۔''

شرما اپنا ٹفن کھولتا ہے جس کے اوپری خانے میں سلاد رکھا ہوا ہے۔ ہاشمی اور ہرجیت بھی اپنے اپنے ٹفن کھولتے ہیں۔ لوبو بوتل کھول کر تھوڑی وہسکی سبھی کے گلاسوں میں ڈال دیتا ہے۔ ہرجیت پانی کی بوتل سے گلاسوں میں پانی ڈالتا ہے۔

سبھی گلاسوں کو آپس میں ٹکراتے ہیں اور پینے لگتے ہیں۔ دو تین گھونٹ پینے کے بعد شرما کہتا ہے، ''یار ہاشمی، برا نہ ماننا۔ مسلمان اس ملک کے لیے کبھی وفادار نہیں ہو سکتا۔''

ہرجیت اور لوبو کو اس وقت یہ ذکر مناسب نہیں لگا۔ ہاشمی شرما کی بات سنتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ پھر وہ بچی ہوئی شراب کو گلے میں اتار کر گلاس میز پر رکھ دیتا ہے۔ ''شرما، ایک بات میں بھی کہوں۔ یہ دیش کیا ہے؟ ندیاں، پہاڑ، زمین! نہیں، یہ دیش نہیں ہے۔ دیش ہے، یہاں کے بسنے والے لوگ..... تم..... تم جو خود کو ہندو کہتے ہو۔ ہندو کے دل میں ہمارے لیے نفرت ہے اور اس کے دل سے یہ نفرت نہیں جا سکتی۔''

لوبو گلاس پھر بھر لیتا ہے۔

''دیکھو'' وہ کہتا ہے، ''شرما، ہاشمی سے نفرت نہیں کرتا اور نہ ہی ہاشمی شرما سے کبھی بے وفائی کرے گا لیکن جب ہم اپنے اپنے مذہبی ماحول میں پہنچتے ہیں تو ہم بدلنے لگتے ہیں۔ تب ہرجیت پکا اکالی بن جاتا ہے اور مجھے اپنا کیتھولک ہونا یاد آنے لگتا ہے۔''

ہرجیت ایک گھونٹ میں گلاس خالی کر دیتا ہے۔ ''دوستو! مجھے لگتا ہے ساری لڑائی طاقت اور دولت کی ہے۔ انسان اقتدار کے لیے لڑتا ہے اور پیچھے

پیچھے دولت آتی ہے۔ اب اس لڑائی کو خواہ مذہب کے نام پر لڑو یا ملک کے نام پر۔ چاہے کسی نظریے کے نام پر لڑو...... بس لڑو...... اور لڑتے چلے جاؤ۔''

بوتل آدھی سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ لوبو نے بات چیت کا رخ دوسری جانب موڑ دیا ہے۔ اب بات چیت کے مرکز میں اشاعتی ادارے کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر رمانی آگئے ہیں۔ لوبو نے اپنے مختلف ذرائع سے حاصل اس اطلاع کو پھر سے دہرا دیا ہے کہ مسٹر رمانی اس فورم میں پروف ریڈر کے طور پر بھرتی ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ انگریزی مالکوں کے چہیتے بنتے چلے گئے۔ اس زمانے میں وہ کمپنی کے ایک ڈائرکٹر بن گئے۔ جب انگریزوں نے اس فورم کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو سب کچھ مسٹر رمانی کے پاس آ گیا۔ آج مسٹر رمانی لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔

علی گڑھ سے پہلے سبھی نے کھانا کھا لیا ہے۔ اب تک کسی نے سونے کی بات نہیں کی ہے۔ سبھی کے دل میں تھا پہلے علی گڑھ نکل جائے۔

علی گڑھ اسٹیشن پر لگ بھگ سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ شرما نے کھڑکیوں کے شیشے نیچے کر دیے ہیں۔ چاروں شیشے سے ہی باہر جھانکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دو چائے والے آواز لگاتے گھوم رہے ہیں۔ پولس کے دو چار جوانوں کے بوٹوں کی آواز اس سناٹے میں گونج رہی ہے۔

گاڑی علی گڑھ اسٹیشن چھوڑتی ہے تو سبھی راحت کی سانس لیتے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے بستر بچھانے لگتے ہیں۔ شرما اور ہاشمی نیچے کی برتھوں پر ہیں۔ سونے سے قبل شرما اٹھ کر ہلکی نیلی روشنی کے علاوہ باقی بتیاں بجھا دیتا ہے۔

لوبو کے خراٹوں کی آواز سب سے پہلے آتی ہے۔ پھر ہرجیت کی ناک بھی ہلکی ہلکی بجنے لگتی ہے۔ شرما اور ہاشمی ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے سونے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ انھیں بھی نیند کا پہلا جھونکا آ گیا ہے۔

تبھی شرما کی آواز سنائی دیتی ہے،''ہاشمی، ہاشمی!''

ہاشمی ایک دم چونک کر اٹھتا ہے،''کیا ہے؟'' گاڑی رکی ہوئی ہے۔ شرما کھڑکی سے کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہاشمی اٹھ کر بتی جلانے کے لیے سوئچ آن کرتا ہے لیکن بتی نہیں جلی۔ تبھی اسے محسوس ہوتا ہے کہ کیبن کے پنکھے بھی بند ہیں اور حبس بڑھ گئی ہے۔ لوبو اور ہرجیت کی نیند بھی گرمی کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

لوبو لیٹے ہوئے ہی کہتا ہے،''شرما، گاڑی رکی ہوئی ہے کیا؟ اور اتنی گرمی کیوں ہو رہی ہے؟''

ہرجیت کہتا ہے،''ارے ہاشمی، لائٹ تو آن کر دو۔''

''لائٹ غائب ہے۔'' ہاشمی اور شرما کے منہ سے ایک ساتھ نکلتا ہے۔ لوبو اور ہاشمی نیچے اتر آتے ہیں۔

گاڑی کھڑی ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ آسمان میں ایک بھی تارہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاشمی اپنے پاس بیٹھے ہرجیت کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہتا ہے،''تمھیں کچھ شور نہیں سنائی دے رہا ہے؟''

سبھی سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دور سے سائیں سائیں کی آواز آ رہی ہے، جیسے کہیں شور ہو رہا ہو۔

کیبن میں اس قدر اندھیرا ہے کہ کسی کو کسی کی شکل صاف نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ شرما لوہے کی سلاخوں کی کھڑکی سے انجن کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اندھیرے میں آگے کے ڈبوں کی خاموش قطار کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

''یار، باہر نکل کر پتہ تو لگائیں کہ آخر بات کیا ہے؟'' ہرجیت کہتا ہے۔

''ذرا کنڈکٹر سے ہی پوچھ کر دیکھیں۔'' لوبو کہتا ہے۔

''خاموش بیٹھے رہو۔'' شرما سخت لہجے میں کہتا ہے۔

سبھی کو لگتا ہے شور بڑھتا جا رہا ہے اور قریب آتا جا رہا ہے۔

تبھی ایک بہت زور کا دھماکہ ہوتا ہے۔ کوئی بھاری اور سخت چیز شرما کی کھڑکی میں لگے سلاخوں سے ٹکراتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے۔ ایک چیخ اور دہشت کیبن میں بھر جاتی ہے۔ شرما اور ہاشمی جلدی اپنی کھڑکیوں کے شٹر اور شیشے نیچے گرا دیتے ہیں۔

کیبن میں گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سبھی کو ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔

کیبن چاروں طرف سے بند ہے۔ پھر بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے باہر شعلے دہک رہے ہوں۔ پسینے سے تربتر اور سہمے ہوئے آٹھوں ہاتھ آپس میں ایک دوسرے کو گرفت میں لیتے چلے جا رہے ہیں۔''

□□□

مترجم کا پتہ:
F-58, Sector-40
Noida-201301 (U.P.)

محمد خلیل

پلاسٹک

انسانی تہذیب و ترقی کے تقریباً چار ہزار برسوں میں انسان مختلف دھاتوں کو استعمال کرتے ہوئے زندگی کی بے شمار ضرورتیں پوری کرتا رہا ہے۔ ہم میں اکثر لوگ گذشتہ صدی کو فولاد (لوہا) کا دور سمجھتے رہے ہیں لیکن بیسویں صدی کے وسط کو پلاسٹک کا ابتدائی دور خیال کیا جاتا ہے۔ جان ویسلی ہاٹ نے تقریباً سو سال قبل پلاسٹک تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پالی اتھیلین پلاسٹک کی ایک شکل ہے۔ اسے زیادہ درجۂ حرارت اور دباؤ کے ردِّ عمل سے خواہش کے مطابق کوئی شکل دی جاسکتی ہے۔ پلاسٹک کو ڈھالنے کے بعد اسے ٹھنڈا کرنے پر یہ ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔

شروع میں پلاسٹک سخت ہونے کی وجہ سے موٹروں، طیاروں اور برقی نظام میں استعمال ہونے لگی۔ اس طرح پلاسٹک کی ایجاد وقت کے ساتھ مقبول ہونے لگی اور آج بھی پلاسٹک کا استعمال بڑھتا جارہا ہے لیکن عوام کے نزدیک ابھی تک پلاسٹک کی بنی ہوئی چیزیں گھٹیا اور کمزور خیال کی جاتی ہیں جب کہ پالی تھین اور الکی تھین وغیرہ سے بنی ہوئی چیزوں کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ اگر ہم پلاسٹک کے اجزا پر غور کریں تو سب سے پہلے کاربن کے ایک ایٹم کو تصور کرنا ہوگا پھر اس ایٹم کو استعمالی گیس کے ایٹم سے ملا دیجیے جسے مانومر کہتے ہیں۔ جس میں "مانومر" کے ایٹم منسلک ہوں جب کہیں "پالی مَر" بنے گا۔ پالی مَر ہی پلاسٹک کی اصل شکل ہے۔ گرم ہونے پر پالی مَر کے تار ایک دوسرے کے ساتھ الجھ کر سخت ہوجاتے ہیں۔ پلاسٹک کی صنعت نے اس کا استعمال عام کرنے کے لیے نئے طریقے دریافت کر لیے۔ آج کل پلاسٹک کا استعمال موٹر خانوں، تفریحات کی اشیا اور باورچی خانوں میں استعمال ہونے والے ڈبّوں کے لیے بے حد عام ہیں۔ پلاسٹک کا استعمال مکان کے لیے دیرپا ٹائل، رنگین پردے، گیس کے چولھوں کے بٹن، برقی گھڑی کے کل پرزے، دیواروں پر لگانے کی ٹائل، ریفریجریٹر کے خانے، طشتریاں، برتن اور اس طرح کی بہت سی چیزیں تیار ہونے لگی ہیں۔ آج پلاسٹک کے کھلونے کس قدر مقبول ہوئے ہیں اور سارے کھلونوں میں پلاسٹک کے کھلونوں کا فیصد تقریباً 80 سے کم نہیں کہا جا سکتا۔ ہاتھ کے بیگ سے لے کر پلاسٹک کی جلدیں پلاسٹک سے بننے لگی ہیں۔ مکانوں میں پلاسٹک کے پائپ اور پتلی نلکیاں استعمال کی جارہی ہیں۔ بھنی ہوئی مکا (پوپ کون) اور کھانے کی مختلف دالیں پالی تھین کی تھیلیوں میں ملنے لگی ہیں۔ آج پلاسٹک کی تیار چیزوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان سب کا ذکر ایک ساتھ کرنا مشکل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پلاسٹک کا استعمال کسی بھی شکل میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف رنگوں میں ہونے کی وجہ سے سبھی کو اپنی جانب راغب کرتی ہے۔ پلاسٹک بڑے پیمانے پر فراہم ہونے اور سستی ہونے کی بنا پر اسے مختلف صنعتوں میں استعمال میں لایا جا رہا ہے کیونکہ پلاسٹک سے بنی اشیا ہلکی ہوتی ہیں۔ کچھ پلاسٹک کمزور بھی ہوتے ہیں لیکن پلاسٹک کو صاف کرنا بہت آسان ہے۔ آج پلاسٹک کی چالیس سے زائد قسمیں تیار کر لی گئی ہیں۔

یہ صنعتی اہمیت کے نقطۂ نظر سے ملائم، سخت، شفاف، پانی سے ہلکی، حرارت روکنے والی اور مختلف خصوصیات کی پلاسٹک دریافت ہو چکی ہیں۔ پلاسٹک کو متعدد بار گرم اور ٹھنڈا کرنے پر تبدیلی کی بنیاد پر دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً تھرمو پلاسٹک اور دوسری تھرموسیٹ۔ تھرمو پلاسٹک کو متعدد بار گرم کرنے سے اس کی بنیادی خصوصیات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے اور وہ بہنے لگتا ہے جس کی وجہ سے اسے کسی بھی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے اور یہ پلاسٹک ٹھنڈی ہونے پر ایک نئی شکل میں آجاتی ہے۔ اس زمرے میں نائیلون، پالی اتھیلین، پالی پروپائیلین، پالی ونائیل اور کلورائیڈ پالی اسٹائیرین آتے ہیں۔

پلاسٹک سب سے کم قیمت کا ہے جو مشینوں میں استعمال ہونے والی پلاسٹک ہے۔ یہ پلاسٹک آگ کی شدت کو کافی حد تک سہن کرسکتی ہے اور جوڑ نہ ہونے کی بنا پر مشینی پرزوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ان کا استعمال پلاسٹک کی کاروں، ریفریجریٹر، الکٹرانک آلات میں بھی ہوتا ہے لیکن پلاسٹک سے بننے والی چھتیں جن پر بجلی، پانی اور گرمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ ایسے اثرات کو قبول کرتی ہیں بلکہ موسم کے برخلاف درجۂ حرارت تبدیل کر لیتی ہیں یعنی سردی میں گرم اور گرمی میں ٹھنڈی رہتی ہیں۔

پی.وی.سی. یعنی پالی وینائیل کلورائیڈ ریزن بھی ایک قسم کی مضبوط پلاسٹک ہے۔ اس میں کچھ کیمیائی اجزا ملا کر بعض دیگر اشیا تیار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً جوتے کی صنعت میں استعمال ہونے والی پلاسٹک چمڑا جو چمڑے جیسی ہی مضبوط ہوتی ہے لیکن اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ پانی میں نہ تو سڑتی ہے اور نہ ہی گلتی ہے۔ ایک دوسری پلاسٹک جسے سینتھٹک ماربل کہتے ہیں پورے طور

پر سنگ مرمر جیسی پلاسٹک نظر آتی ہے۔ اس کا استعمال فرش بنانے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضبوطی میں سنگ مرمر جیسی ہی مضبوط ہے۔ ایکسپینڈیڈ پالی تھیلین پلاسٹک روئی کی طرح نرم اور فوم کی طرح آرام دہ ہے۔ اس کے گدے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ ہنوز پلاسٹک کی صنعت میں نئے تجربات ہو رہے ہیں۔

پلاسٹک زرعی طور پر بھی مفید ہے۔ پلاسٹک کے ذریعے کھیتوں میں پانی پہنچایا جا سکتا ہے اور اس کی چھوٹی نلکیوں سے پانی کے استعمال میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ پلاسٹک کے برتنوں میں جراثیم کش رقیق کو جمع کیا جا سکتا ہے اور بچت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اناج کے گوداموں میں فرش میں پلاسٹک لائننگ کا استعمال کرنے سے اناج کی بچت کی جا سکتی ہے اور اس طریقے سے اناج کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہتا ہے۔

اس کے برعکس شہروں میں نکلنے والے روزانہ کوڑے کرکٹ میں اضافہ ہونے سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں پلاسٹک کی بنی ہوئی چیزیں خاص طور پر بڑی مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔ کوڑا کرکٹ تو عام طور پر وقت کے ساتھ گل جاتا ہے، دھاتوں میں زنگ لگ جاتا ہے، لکڑیاں سڑ جاتی ہیں لیکن پلاسٹک نہ تو سڑتی ہے اور نہ ہی گلتی ہے بلکہ اسی حالت میں موجود رہتی ہے۔ اس طرح پلاسٹک قدرتی ماحول میں کسی بھی طرح ضائع نہیں ہوتی لیکن کوڑے کرکٹ میں پلاسٹک کے حقدار زیادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی بیکار چیزوں کو پھینک دینے کی عادت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جیسے کشمیر کی ڈل جھیل میں ہم ناؤ میں سیر کر رہے ہیں لیکن چیزوں کو کھانے کے بعد اور خاص طور پر پیکنگ کے پالی تھین کے تھیلوں (جو پلاسٹک سے بنائے جاتے ہیں) کو جھیل میں پھینکتے جاتے ہیں جس سے جھیل بے حد آلودہ ہو گئی ہے۔ اور یہ ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آ گیا ہے۔ کوڑے کرکٹ میں موجود پالی تھین کے تھیلوں کو جانور بھی جاتے ہیں جو ان کے پیٹ میں پہنچ کر جمع ہوتا رہتا ہے اور اس سے جانور بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ماہرین نے ایسے جانوروں کی تعداد تقریباً 35 لاکھ بتائی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں ربر، چمڑے اور جوٹ کی بنی چیزوں کی جگہ پلاسٹک کا استعمال ہو رہا ہے۔ پلاسٹک پیٹرو کیمیا سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں کئی طرح کے ایسے اجزا موجود ہوتے ہیں جو ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ آج کوڑے کرکٹ میں پالی تھین کے پھینکے ہوئے تھیلوں کی مقدار دس فیصد ہوتی ہے یہ دس فیصد مقدار کم نہیں ہے کیونکہ یہ ضائع ہی نہیں ہوتے۔

پالیسٹرین نامی پلاسٹک کو جلانے سے کلورو فلورو کاربن باہر آتے ہیں جو زندگی کا تحفظ کرنے والی اوزون کو تباہ کرتے ہیں۔ یہ خطرناک اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں۔ اس خطرے کو دیکھتے ہوئے کئی ممالک میں پلاسٹک کے کوڑے کرکٹ کو جلانے پر روک لگا دی گئی ہے۔ پلاسٹک ضائع نہ ہونے کی وجہ سے صفائی کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ سیور کے بند ہونے میں بھی پلاسٹک کے ٹکڑے یا تھیلیاں مسئلہ پیدا کرتی ہیں۔ جن علاقوں میں کوڑا کرکٹ ڈلتا ہے وہاں کا ماحول نقصان دہ گیسوں سے آلودہ ہوتا رہتا ہے اور گرمی کے دنوں میں پلاسٹک کے زہریلے اثرات زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور ان علاقوں میں کچھ گھنٹے تک رہنا اور ان آلودہ خطرات کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو صحت کے لیے نہایت مضر ہیں۔ سائنس داں اس کوشش میں لگے ہیں کہ کچھ تکنیکی طریقوں سے پلاسٹک کو گلا کر پھر سے اسے استعمال کے قابل بنایا جا سکے۔ اس عمل کو ''ری سائیکلنگ'' کہتے ہیں۔ یہ عمل مشکل بھی ہے اور اس عمل پر صرفہ بھی بہت آتا ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اگر آپ پچاس ہزار پالیتھین بیگ تیار کریں تو تقریباً 17 کلو سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس ماحول میں پہنچ جاتی ہے اور مونو آکسائیڈ، نائٹروجن اور ہائیڈرو کاربن بھی ہوا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب فائبر بنائے جاتے ہیں تو اس میں کم سے کم تیرہ کلو نائٹروجن آکسائیڈ اور بارہ کلو سلفر آکسائیڈ نکل کر ماحول میں جا پہنچتی ہے۔ ان گیسوں سے پودوں، درختوں اور فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ قدرتی طریقے کے مطابق نہیں بڑھتے۔ اس طرح پلاسٹک کے ذریعے ماحولیات بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے سائنس دانوں نے ماحولیات کو پلاسٹک کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے پلاسٹک تیار کیے ہیں جو قدرتی طریقے سے سڑ گل سکتے ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسے ہیں جو بیکٹیریا یا پھپھوند وغیرہ کو گلا کر ختم کر سکتے ہیں۔ دوسری طرح کے وہ پلاسٹک ہیں جو دھوپ کی گرمی سے سڑ گل سکتے ہیں لیکن اس کی تیاری نہایت صرفے والی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طریقے زیادہ مقبول نہیں ہو سکے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ پلاسٹک کی طرف زیادہ راغب نہ ہوں اور اس کا استعمال کم سے کم کرتے جائیں۔ اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ مستقبل میں ہمارے سائنس داں کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نتیجتاً پلاسٹک سے ہم کہیں زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

□□□

پتہ:
H-51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi-110025.

منیر انجم

دفتر، اس کی خدمات اور طریق کار

دفتر سے مراد کسی ادارے کے اس حصے سے ہوتی ہے جس میں ابتدائی یا محرری سے متعلق کام انجام پاتے ہیں۔ کوئی بھی ادارہ خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اس میں مختلف اقسام کے کام انجام دیے جاتے ہیں جن کا آغاز کاغذی کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ کاغذی یا دفتری کام کہلاتے ہیں۔ کاغذی کام سے مراد متعلقہ افراد یا ادارے سے رابطہ کرنا، باہر سے آنے والی ڈاک وصول کرنا اور مروجہ اصول و ضوابط کے تحت ان کا فیصلہ کرنا، مسل بندی کرنا، اشاریہ بنانا، آمد و خرچ کا حساب رکھنا وغیرہ۔ یہ سبھی کام ادارے کے دفتر میں انجام دیے جاتے ہیں۔

کسی بھی ادارے کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ایک مرکزی اکائی کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے کاروبار کے تمام امور کی نگرانی کی جاتی ہے۔ دفتر کی بدولت ادارے کے مختلف شعبوں میں نظم و نسق اور رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ ادارے کی پالیسیاں اور منصوبے بنانے، ان پر عمل درآمد کرانے کے لیے بھی دفتر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس طرح یہ ادارے کے دماغ، کان اور آنکھ کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دفتر کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ کام محرر کی میز سے منتظم اعلیٰ کی میز تک پھیلا ہوا ہے۔

دفتر کسی بھی ادارے کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے مختلف عہدے دار ادارے کے کاموں پر یہیں سے کنٹرول کرتے ہیں۔ دفتر ہی میں ادارے کے مختلف شعبوں سے معلومات جمع کی جاتی ہیں اور دفتر ہی خرید و فروخت، خام مال اور اسٹاک کی آمد و رفت، گاہک اور بازار سے متعلق سبھی معلومات و اطلاعات کا مرکز ہوتا ہے جہاں سے ضروری اطلاعات و معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اعداد و شمار سے اور معلومات کے اس مرکز سے جو بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں ان کی روشنی میں انتظامیہ کے عہدے دار ادارے سے متعلق تمام فیصلے کرتے ہیں۔ یہیں ادارے سے متعلق سبھی کاغذات بحفاظت رکھے جاتے ہیں اور ادارے کے اندراجات وغیرہ کا کام بھی انجام دیا جاتا ہے۔ ایک عام آدمی کی نظر میں دفتر ایک ایسی جگہ ہے جہاں محرری یا کلرکی کے سبھی کام انجام پاتے ہیں اور جہاں ادارے سے متعلق ہر طرح کے کاغذات فائلیں اور دستاویز وغیرہ کا ریکارڈ منظم طریقے سے رکھا جاتا ہے۔

کسی ادارے میں ایک مرکزی اکائی کے علاوہ شعبہ جاتی دفاتر بھی ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر کسی ادارے میں ایک مرکزی دفتر کے علاوہ مالیات، املاک و تعمیرات، حساب کتاب، انتظامیہ، منصوبہ بندی، اعداد و شمار، خرید و فروخت وغیرہ کے شعبہ جاتی دفاتر ہو سکتے ہیں۔

سرکاری دفاتر کا طریق کار کاروباری دفاتر کی بہ نسبت کئی لحاظ سے مختلف اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں جو خطوط وصول ہوتے ہیں انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے لیے مندرجہ ذیل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے:

1. ڈاک کی وصولیابی:

دفتر میں متعدد خطوط، دستاویزات، پارسل قاصد یا ڈاک کے ذریعے موصول ہوتے ہیں۔ اسے ''موصول شدہ ڈاک'' کہتے ہیں۔ موصول شدہ ڈاک دفتر کے شعبۂ رسل و رسائل میں بھیج دی جاتی ہے۔ ڈاک وصول ہونے کے بعد اگلا مرحلہ اسے کھولنے کا ہوتا ہے۔ خطوط کو کھولتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ لفافے کے اندر کا کوئی خط پھٹ نہ جائے یا کسی دوسری وجہ سے ضائع نہ ہو جائے۔ ڈاک کھولنے کے بعد اس پر موصول ہونے کی تاریخ درج کی جاتی ہے جس سے خط دیکھتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دفتر میں اس کی وصولیابی کب ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لیے مہر کا استعمال کیا جاتا ہے جو ادارے کے نام، وصول ہونے کی تاریخ اور نمبر شمار پر مشتمل ہوتی ہے۔

جن خطوط پر انتہائی خفیہ یا خفیہ لکھا ہوتا ہے انھیں کھولے بغیر افسر کے سپرد کر دیا جاتا ہے نیز ذاتی خطوط براہ راست متعلقہ افسر کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ باقی تمام خطوط کو وصولیابی کے رجسٹر میں اندراج کر کے افسر کے ڈاک پیڈ میں رکھ دیا جاتا ہے اور ڈاک پیڈ ہر روز شام کو افسر کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

تمام سرکاری دفاتر میں موصولہ ڈاک کے لیے ایک رجسٹر استعمال کیا جاتا ہے جس میں تمام وصول شدہ ڈاک کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ڈاک کھولنے کے بعد اس کلرک کے پاس بھیجی جاتی ہے جس کے پاس یہ رجسٹر ہوتا ہے۔ وہ تمام خطوط کا اندراج اس رجسٹر میں کر لیتا ہے۔ دفتری اصطلاح میں اسے ڈائری کرنا کہتے ہیں اور اس کام کو کرنے والا کلرک ''ڈائرسٹ'' کہلاتا ہے۔ یہ رجسٹر درج ذیل کالموں پر مشتمل ہوتا ہے:

وصول ہونے والی ڈاک کے رجسٹر کا نمونہ

نمبر شمار	وصول ہونے کی تاریخ	خط نمبر و تاریخ	بھیجنے والے کا نام	موضوع	کس شعبے/شخص کو مارک کیا گیا	کیفیت

اس رجسٹر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں تمام آنے والے خطوط کا مستقل ریکارڈ رکھا جا سکے اور خطوط کی نقل و حرکت سے باخبر رہا جا سکے۔ اسے مستقبل میں حوالے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس خط یا دستاویز کا اس رجسٹر میں اندراج ہو جاتا ہے دفتر کے لیے اس کی حفاظت لازمی ہو جاتی ہے۔ اس طرح خط کی وصولیابی کی شہادت قائم ہو جاتی ہے۔

متعلقہ کلرک ان خطوط/مراسلات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی نوعیت کے پیش نظر حسب ذیل خانوں میں تقسیم کر کے ان پر اسٹکر سلپ لگا دیتا ہے۔

(الف) جلدی (ب) ضروری

(ج) فوری

مذکورہ بالا سلپیں لگانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ افسر خط کو پڑھے بغیر اس کی نوعیت اور اہمیت سے آگاہ ہو جائے اور اسی لحاظ سے ان پر حسب قاعدہ کارروائی کرنے کے احکامات جاری کر سکے۔ عموماً یہ سلپیں موٹے کاغذ پر چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے چھپی ہوئی سلپیں موجود نہ ہوں تو سرخ روشنائی سے لکھ کر سلپ لگا دی جاتی ہے۔

متعلقہ افسر عموماً وصول شدہ ڈاک کو اپنے ماتحت افسران کے نام نشان زد کرتا ہے جب کہ بعض اوقات براہ راست متعلقہ کارکن کو اور وہ افسران یہ ڈاک متعلقہ کارکنان کے نام مارک کر دیتے ہیں۔

2. سرخ روشنائی سے اندراج:

متعلقہ کلرک سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ وصول ہونے والے مراسلے کی فائل بنی ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر فائل موجود ہے تو وہ اس فائل سے متعلقہ معلومات اخذ کر کے موجودہ مسئلے پر نوٹ لکھتا ہے۔ اگر اس نام کی فائل موجود نہیں ہے تو پہلے اس نام سے نئی فائل بناتا ہے اور اسے نمبر شمار کے مطابق نمبر دیتا ہے۔ اب متعلقہ کلرک اسکو پڑھنے کے بعد فائل میں کیفیتی شیٹ جسے دفتری اصطلاح میں 'نوٹ شیٹ' کہا جاتا ہے، پر کارروائی شروع کرنے سے قبل درج ذیل اندراجات کرتا ہے:۔

(الف) نمبر شمار (ب) خط بھیجنے والے کا نام

(ج) خط نمبر اور تاریخ (د) خط کا عنوان/موضوع

یہ اندراج سرخ روشنائی سے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اسے ''ریڈ انٹری'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب فائل متعلقہ افسر کے پاس جائے تو پہلی ہی نظر میں پتہ چل جائے کہ اس کا تعلق کس شعبے یا مسئلے سے ہے۔

3. مختصر کیفیت نگاری

ادارے کے کسی بھی معمولی یا غیر معمولی فیصلے کے لیے حاکم مجاز کی منظوری حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ حکومت ہند و ریاستی حکومتوں میں مروجہ طریقۂ کار کے مطابق اس کام کے لیے ''مختصر کیفیت نگاری'' کو اپنایا جاتا ہے۔ ''مختصر کیفیت نگاری'' وہ طریقۂ کار ہے جس میں زیر غور معاملے کے حل کے لیے متعلقہ کارکن و افسران کی تحریری آرا قلمبند کی جاتی ہیں۔ اس میں ماضی کا لب لباب، زیر غور معاملے کا تجزیہ اور قواعد و ضوابط کی روشنی میں مسئلے کے حل کی ممکنہ تجاویز حاکم مجاز کی منظوری حاصل کرنے کی غرض سے پیش کی جاتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر غور معاملے پر نوٹ شیٹ پر ریکارڈ کی گئی تحریری آرا کو دفتری اصطلاح میں ''نوٹ'' اور اپنائے گئے طریقہ کو ''نوٹنگ'' کہتے ہیں یا زیر غور معاملے کی نکاسی کے لیے نوٹ شیٹ پر رقم کی گئی آرا، مشاہدات و نظریات کو ''نوٹ'' کہتے ہیں۔

متعلقہ کلرک زیر غور مراسلے پر تجویز شدہ کارروائی کا اندراج کرتا ہے۔ دفتری طریقۂ کار میں یہ کام نہایت اہم ہوتا ہے۔ متعلقہ کلرک خط پر اپنے خیالات لکھنے سے قبل پورے معاملے کا اول تا آخر مطالعہ کرتا ہے اور طے شدہ پالیسی اور مروجہ قوانین کا حوالہ دیتے ہوئے فائل حاکم مجاز کی منظوری کے لیے پیش کرتا ہے۔

نوٹ بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ نوٹ مناسب پیراگرافوں میں تقسیم ہو۔ ایسا نہ ہو کہ صرف ایک یا دو پیراگرافوں میں سارے معاملے کو ٹھوس دیا جائے یا غیر ضروری پیراگرافوں کی بھر مار کر دی جائے بلکہ حسب ضرورت پیراگراف بنانا چاہیے۔ اختصار نوٹنگ کی ایک نہایت اہم خصوصیت ہے۔

نوٹ حسب مراتب افسران بالا کی رائے رقم کرتے ہوئے بالآخر حاکم مجاز کو بھیجا جاتا ہے۔ حاکم مجاز نوٹ میں درج تمام حقائق کی روشنی میں احکامات یا ہدایات دیتا ہے اور فائل اسی چینل سے واپس متعلقہ کلرک کے پاس آتی ہے۔ اب متعلقہ کلرک حاکم مجاز کے احکامات و ہدایات کے مطابق حکم نامہ، گشتی مراسلہ، یادداشت، دفتری یادداشت، دفتری حکم نامہ وغیرہ کا خاکہ افسر شعبہ کی منظوری کے لیے پیش کرتا ہے۔ اسے دفتری اصطلاح میں ''مسودہ برائے منظوری'' کہا جاتا ہے۔

مسودہ نگاری

کسی مراسلے یا تحریر کا ابتدائی خاکہ جو افسر بالا کی منظوری و ضروری

اصلاح کی غرض سے تیار کیا جائے، دفتری اصطلاح میں 'ڈرافٹ' کہلاتا ہے۔
متعلقہ کلرک نوٹ شیٹ پر حاکم مجاز کی ہدایت کے مطابق جواب کا کچا خاکہ افسر بالا کی منظوری کے لیے پیش کرتا ہے یہی ڈرافٹ کہلاتا ہے اور اس انداز تحریر کو 'ڈرافٹنگ' کہتے ہیں۔ افسر شعبہ ضروری کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد اسے حاکم مجاز کی منظوری کے لیے بھیج دیتا ہے۔ حاکم مجاز حسب ضرورت تصحیح کرنے یا اسے جوں کا توں منظور کرنےکے بعد متعلقہ کلرک کو واپس بھیج دیتا ہے اور کلرک افسر/حاکم کے ذریعے کی گئی تصحیح کرنے کے بعد اس تحریر کو صاف صاف لیٹر پیڈ پر ٹائپ کرکے افسر کے سامنے دستخط کے لیے پیش کرتا ہے۔ تصحیح شدہ تحریر حاکم مجاز کے دستخط کے بعد متعلقہ شخص یا ادارے کو ارسال کر دی جاتی ہے۔

بہ الفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈرافٹنگ وہ فن تحریر ہے جس میں کسی مجوزہ جواب کا کچا خاکہ افسر بالا کی منظوری کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرافٹ عموماً متعلقہ کلرک ہی تیار کرتا ہے۔ متعلقہ کلرک ڈرافٹ افسر شعبہ کو پیش کرتے وقت اس پر ''مسودہ برائے منظوری'' یا کا فلیگ لگا دیتا ہے۔

خط تیار ہونے کے بعد مکتوب الیہ کو بھیجنا ہوتا ہے۔ متعلقہ شعبہ ایسے تمام خطوط کو شعبۂ ترسیل میں بھیج دیتا ہے جہاں سے انھیں باہر بھیجنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ شعبہ ادارے کے مختلف شعبوں سے باہر جانے والی ڈاک جمع کرتا ہے۔ اس کے بعد خطوط کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں بھیجنے کا انتظام کرتا ہے۔ مثلاً فوری اہمیت کے مقامی خطوط چپراسی کے ذریعے تقسیم کرا دیے جاتے ہیں اور دیگر خطوط کو ڈاک یا کوریئر کے ذریعہ بھیج دیا جاتا ہے۔ دور حاضر میں انٹرنیٹ کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے اس لیے پیغامات کی ترسیل کے لیے ای. میل کا استعمال بھی بڑھ رہا ہے۔ بذریعۂ ڈاک باہر جانے والے خطوط عام طور پر مندرجہ ذیل مراحل سے گذرتے ہیں:

(الف) ترسیل کے رجسٹر میں اندراج:

تمام خطوط کو باہر بھیجنے سے پہلے ایک رجسٹر میں ان کا اندراج کیا جاتا ہے۔ جسے ''خطوط کی ترسیل کا رجسٹر'' کہتے ہیں۔ یہ مندرجۂ ذیل کالموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

نمبر شمار	تاریخ	خط نمبر	مکتوب الیہ کا نام و پتہ	ٹکٹ کی مالیت	ذریعہ ترسیل	کیفیت

اس رجسٹر پر نظر ڈالنے سے یہ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس تاریخ کو کتنے خطوط بھیجے گئے ان میں دستی بھیجے گئے خطوط کی تعداد کیا تھی؟ ٹکٹوں پر آنے والا کل خرچ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دستی بھیجے جانے والے خطوط کا علاحدہ رجسٹر میں بھی اندراج کیا جاتا ہے۔ اسے دفتری اصطلاح میں 'Peon Book' کہا جاتا ہے۔ اس رجسٹر میں خط لے جانے والا وصول کنندہ کے دستخط کراتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار	تاریخ	خط نمبر	مکتوب الیہ کا نام و پتہ	خط لے جانے والے کا نام	وصول کنندہ کے دستخط	کیفیت

مندرجہ بالا مراحل سے گزرنے کے بعد کسی سرکاری دفتر میں موصول ہونے والی ڈاک اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

نوٹنگ کی اقسام اور نوعیت

سرکاری کام کاج میں نوٹنگ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اختصار اور جامعیت نوٹنگ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کے علاوہ نوٹنگ ترتیب وار اور موزوں ہونی چاہیے۔ مختلف عنوانات کے معاملات پر نوٹنگ کرتے وقت ذیل میں درج طریق کار اپنانا چاہیے:

عارضی معاملات

افسر شعبہ یا ڈائرکٹ اس قسم کے معاملات کو ڈاک کے مرحلے پر ہی 'مسل' میں بھیج دیتے ہیں۔ اس پر مختصراً یہ بھی ریکارڈ کر دیا جاتا ہے کہ اس پر کیوں کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے معاملات کو دفتری اصطلاح میں 'No-noting cases' کہا جاتا ہے اور انھیں 'O' بنڈل میں رکھا جاتا ہے نیز انھیں ہر سال 31 دسمبر کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسے معاملات کی اصل درخواستوں کو ضروری معلومات درج کرنے کے بعد درخواست گذار کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

معمولی یا بار بار آنے والے معاملات

بکثرت آنے والے معاملات کے لیے مخصوص قسم کے نوٹس استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں Standard Process Sheets بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں طے شدہ نکات کی نشاندہی کی جاتی ہے اور زیر غور معاملے سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے خالی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے ایک ہی نوعیت کے متعدد معاملات کے لیے بار بار نوٹ نہیں بنانا پڑتا بلکہ ہر نئے معاملے کی معلومات کو خالی جگہ میں بھر کر بآسانی حاکم مجاز کی منظوری حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس سے دفتر کے سامان تحریر اور کارکنان کے قیمتی وقت کی بچت بھی ہوتی ہے۔

معمولی نوعیت کے معاملات کے سلسلے میں عام طور پر نوٹس نہیں بنائے جاتے بلکہ متعلقہ کارکن افسر شعبہ کی جانب سے ازخود جواب تیار کرکے افسر

کے سامنے دستخط کے لیے پیش کر دیتا ہے یا پھر جواب کا مسودہ برائے منظوری پیش کرتا ہے۔

معاملات زیر مراسلت

یہ وہ معاملات ہوتے ہیں جن کی فائلیں یا جوابی خط دستخط کے لیے حاکم مجاز کے پاس بھیجے جا چکے ہوتے ہیں۔ ایسے معاملات کے لیے بھی تفصیلی نوٹ نہیں بنائے جاتے بلکہ ایک یا دو پیراگرافوں پر مشتمل نوٹ جس میں معاملے کی پیش رفت کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے یا پھر متعلقہ کارکن درخواست پر معاملے کی نوعیت اور پیش رفت لکھ کر فائل کی واپسی تک اسے اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔

تصفیہ طلب معاملات

کسی بھی ادارے کے یہ نہایت اہم معاملات ہوتے ہیں۔ ان معاملات کے سلسلے میں تفصیلی نوٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تفصیلی ہونے کے باوجود نوٹس اختصار کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ زیر غور معاملے سے متعلق ہر بات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی حقائق کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے نوٹس بناتے وقت مندرجۂ ذیل باتوں کو سلسلہ وار پیش کرنا چاہیے:

(الف) معاملہ/مسئلہ کیا ہے؟
(ب) کس وجہ سے وجود میں آیا؟
(ج) معاملے سے متعلق مروجہ قواعد وضوابط
(د) قواعد کی روشنی میں معاملے کا ممکنہ حل
(ح) ممکنہ حل میں بہترین حل اور کیوں؟
(و) ممکنہ حل کے نتائج وغیرہ۔

پالیسی ومنصوبہ بندی سے متعلق معاملات

اس قسم کے معاملات تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہوتے ہیں اور عموماً ادارے کے اعلیٰ افسران کے درمیان زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ ایسے معاملات کے لیے گہرائی سے مطالعہ کرنے اور ترتیب وتسلسل کے ساتھ جامع نوٹنگ کی جاتی ہے۔

مذکورہ معاملات کے لیے نوٹنگ کے بنیادی عناصر درج ذیل ہیں:

(الف) معاملہ

نوٹ کے ابتدائی پیراگراف میں پریشانی یا معاملے کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد معاملے وجود میں آنے کے اسباب کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔

(ب) ضمنی معلومات:

اگلے پیراگراف میں کیس کو واضح کرنے کے لیے اس سے متعلق اضافی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ معلومات شعبے میں موجود فائل و دیگر دستاویزات سے حاصل کی جاتی ہیں۔

(ج) قواعد وضوابط نیز پالیسی وغیرہ کا ذکر:

حسب ضرورت متعلقہ قواعد، پالیسی، احکامات اور سابقہ و مروجہ ضابطے کی روشنی میں زیر غور معاملے کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

(د) سابقہ/سابق رمائل:

زیر غور معاملے کی نوعیت کے سابقہ معاملات کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے جو کئی اعتبار سے موجودہ معاملے سے مختلف ہوتا ہے۔ سابقہ اور موجودہ معاملات کے درمیان فرق ونتائج کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے اور اس کی روشنی میں زیر غور معاملے کا مناسب ومعقول حل تلاش کیا جاتا ہے۔

(ح) تنقیدی تجزیہ:

نوٹ کے اس حصے میں معاملے کے متبادل اور بہترین حل کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

(و) اختتامی پیراگراف:

یہ کسی بھی نوٹ کا آخری پیراگراف ہوتا ہے اس لیے اس کو اختتامی پیراگراف کہا جاتا ہے۔ اس میں زیر غور معاملے سے متعلق لائحۂ عمل مختصراً پیش کیا جاتا ہے تاکہ اعلیٰ افسران بآسانی نتیجہ اخذ کر سکیں۔ ایسے معاملات جن میں فیصلہ اعلیٰ کمیٹی یا بورڈ کو لینا ہوتا ہے۔ زیر غور معاملے کے ہر پوائنٹ کو بالترتیب اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

نوٹ بنانے کے لیے ضروری ہدایتیں

1. نوٹس عموماً نوٹ شیٹس پر ریکارڈ کیے جاتے ہیں۔
2. نوٹس ہمیشہ مختصر مگر جامع ہونے کے ساتھ بے جا لفاظی اور غیر ضروری تفصیلات سے پاک ہونے چاہئیں۔ طویل اور متجاوز نوٹنگ سے گریز کرنا چاہیے۔
3. نوٹ بناتے وقت براہ راست انداز تحریر استعمال کرنا چاہیے۔ پیچیدہ اور غیر واضح الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔
4. زیر غور مراسلے میں درج جملوں، پیراگرافوں یا حقائق کو نوٹس میں لفظ بہ لفظ پیش نہیں کرنا چاہیے۔
5. جب کسی فائل پر حقائق پہلے ہی تفصیل سے موجود ہوں تو ایسی صورت میں نوٹ میں انکا اعادہ کرنا مناسب نہیں۔ اسکی تفصیل 'کوٹ' کرنے کے بجائے صرف اسکا حوالہ دے دینا کافی ہوتا ہے۔
6. زیر غور مراسلے پر درج حاکم مجاز یا افسر شعبہ کی رائے کا خلاصہ کرتے

وقت سب سے پہلے دوبارہ ریکارڈ کرنا چاہیے۔

7. کسی مسئلے پر تجاویز یا احکامات دیتے وقت حاکم مجاز/افسر بالا کو اپنی رائے محدود الفاظ میں پیش کرنی چاہیے۔ نوٹ میں درج باتوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر افسر بالا پیش کی گئی تجاویز یا لائحہ عمل سے متفق ہے، تو وہ نوٹ پر اپنی قلم سے انھیں تجاویز کو لکھنے کے بجائے صرف دستخط ثبت کر دیگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ افسر بالا متذکرہ بالا تجاویز سے اتفاق کرتا ہے اور انھیں منظور کرتا ہے۔

8. ہر مسئلے کا بیانیہ خلاصہ افسران بالا کو پیش کرنا چاہیے۔ خلاصہ مختصر ہو اور تمام متعلقہ حقائق کو بھی واضح طور پر بیان کرتا ہو نیز مسئلے سے متعلق دوسرے دفاتر یا افسران کی رائے، اگر کوئی ہو اس کا ذکر بھی نوٹ شیٹ میں ضروری کرنا چاہیے۔

9. نوٹ سے متعلق ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ حاکم مجاز نوٹ میں درج باتوں کی روشنی میں ہی فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا نوٹ بنانے والے افسر یا کارکن کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ مسئلے سے متعلق کوئی بھی ایسی بات/قانون کو دانستہ طور پر پوشیدہ نہ رکھے جو فیصلے پر اثر انداز ہو۔

10. نوٹنگ دفتری ریکارڈ کے لیے ہوتی ہے جسے کسی بھی صورت میں صاحب معاملہ پر ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔

11. نوٹ بنانے والے کارکن کو چاہیے کہ نوٹ مکمل کرنے کے بعد نوٹ شیٹ کے دائیں جانب اپنے مختصر دستخط کرے اور فائل افسر بالا کو پیش کرے۔ افسر اپنی رائے قلمبند کرنے کے بعد نوٹ شیٹ کے بائیں جانب اپنے دستخط مع نام، عہدہ اور تاریخ ثبت کرتا ہے اور فائل منظوری کے لیے حسب مراتب اپنے افسر بالا کو بھیجتا ہے۔

12. نوٹ مناسب پیراگرافوں پر مشتمل ہونا چاہیے اور حسب ضرورت نمبر شمار اور عنوانات بھی درج کرنے چاہئیں۔

□□□

پتہ:
1681, Gali Takht Wali
Suiwalan, Darya Ganj
New Delhi-110002

دیوان آبرو

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اوّلین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات آبرو کے چھ دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/25 روپے

دستنبو

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ و شنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی فوجی بغاوت کے دنوں میں دارالسلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات: 88، قیمت: -/12 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات: 317، قیمت: -/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام

ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری "پرواز" نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات و حقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی. ڈی. (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی. ڈی.): -/175 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

افتخار الزماں

سروجنی نائیڈو

سروجنی نائیڈو بیک وقت انگریزی کی ایک عظیم شاعرہ، عظیم مجاہدۂ آزادی، دانشور و مدبر خاتون کے ساتھ ساتھ زبردست قائدانہ صلاحیت کی حامل، آتش بیاں مقرر، سچی محبِ وطن اور ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کی حامی تھیں۔

سروجنی نائیڈو 13 فروری 1879 کو حیدرآباد کے ایک بنگالی برہمن خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد اگھورے ناتھ چٹوپادھیائے ایک سائنس داں اور ماہر تعلیم تھے اور نظام کالج حیدرآباد کے پرنسپل بھی رہے۔ ان کی والدہ سنسکرت زبان کی ماہر اور بنگالی زبان کی شاعرہ تھیں۔ سروجنی نائیڈو اپنے والدین کی آٹھ اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ ابتدائی تعلیم مدراس میں ہوئی۔ پڑھنے میں ذہین تھی اس لیے صرف بارہ سال کی عمر میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا۔ پوری مدراس پریزیڈنسی میں اول آنے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیجا گیا۔ لندن میں انھوں نے کنگز کالج اور کیمبرج کے گرٹن کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن انھوں نے پڑھائی لکھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔

سروجنی نائیڈو کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ حالانکہ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ سائنس کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام دیں۔ لیکن ایک چھوٹے سے واقعے نے ان کی اس سوچ کو تبدیل کردیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار سروجنی الجبرا کے ایک مسئلے کا حل نکالنے میں ناکام رہیں۔ لیکن اسی دوران انھوں نے ایک نظم لکھ ڈالی۔ اپنی بیٹی کی اس پوشیدہ صلاحیت سے متاثر ہوکر انھوں نے اسے شاعری کی ترغیب دی۔ انگریزی زبان میں ان کی نظمیں اگھورے ناتھ کو اتنی اچھی لگیں کہ 1903 میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرادیا۔

انگلستان میں قیام کے دوران سروجنی نائیڈو کے دوستوں اور اس وقت کی ادبی ہستیوں نے ان کی شاعری کی بہت تعریف کی۔ ان اشخاص نے سروجنی کو اپنی شاعری میں ہندوستانیت کو موضوع بنانے کی ترغیب دی۔ وہ تقریباً اگلے بیس سال تک نظمیں لکھتی رہیں اور اس عرصے میں ان کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ سروجنی نائیڈو کی نظموں کے پہلے مجموعے "سنہری دہلیز" (1905) کی خوب پذیرائی ہوئی۔ انگلستان کے اخبارات میں اس مجموعہ پر تبصرے شائع ہوئے۔ "سنہری دہلیز" کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "وقت کا پرندہ" 1912 میں منظر عام پر آیا۔ ان کی نظموں کا تیسرا مجموعہ "شکستہ پر" 1917 میں شائع ہوا اور آخری شعری مجموعہ "بانسری ایک عصائے شاہی" 1937 میں زیور اشاعت سے آراستہ ہوا۔

بلاشبہ ان کی شاعری نے جدید ہندوستانی ادب پر واضح نقوش چھوڑے ہیں۔

سروجنی نائیڈو 1898-1895 تک انگلستان میں رہیں اور وطن واپس لوٹنے کے بعد ڈاکٹر گووندراجولو نائیڈو سے شادی کرلی جو فوج میں ڈاکٹر تھے۔

1905 میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے خلاف بدیسی مال کے بائیکاٹ سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ اس عوامی تحریک میں سروجنی نائیڈو کے کردار کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں سروجنی نائیڈو نے انتہائی سحر انگیز تقریریں کیں۔ کم سنی کے باوجود ان کی جادو بیانی سے طلبہ برادری ان کی گرویدہ ہوگئی۔ 1919-1917 کے دوران انھوں نے جملہ عظیم سیاسی مسائل میں سرگرم حصہ لیا۔

گوپال کرشن گوکھلے کے مشورے پر وہ سرگرم طور پر قوم کی خدمت کے لیے تیار ہوگئیں۔ اور اپنی زندگی اور اپنے گیت اپنی قوم کے لیے وقف کردیے۔ لندن میں قیام کے دوران ان کی ملاقات گاندھی جی سے بھی ہوئی تھیں۔ اور اس ایک ملاقات نے گویا ان کی آئندہ زندگی کا راستہ طے کردیا۔ گاندھی جی جب جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کا ساتھ دے رہے تھے تو اس وقت سروجنی نائیڈو نے بھی ایک فعال رضاکار کے طور پر کام کیا۔ آزادی کا پرچم بلند کرنے کے لیے وہ پورے ہندوستان کا دورہ کرتیں اور ہندو مسلم اتحاد پر بھی زور دیتی تھیں۔ ان کے بقول متحد ہوئے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندو، مسلم ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔

سروجنی نائیڈو انڈین نیشنل کانگریس کی ایک بڑی رہنما کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں اور 1925 میں انڈین نیشنل کانگریس کے کانپور اجلاس میں وہ صدر منتخب ہوئیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں سروجنی نائیڈو نے ہندوستان کی

سماجی، اقتصادی اور صنعتی ترقی پر زور دیا۔ ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک بنانے کے لیے مل جل کر کام کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے اپنی تقریر کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا۔ ''آزادی کے لیے لڑائی میں خوف ایک ناقابل معافی غداری ہے اور مایوسی ایک ناقابل معافی گناہ۔''

پنجاب کے شہر امرتسر میں 1919 میں جلیانوالا باغ کے قتل عام سے پوری قوم غصے سے بھڑک اٹھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس وحشیانہ حرکت کے خلاف 'سر' کا خطاب واپس کر دیا اور سروجنی نائیڈو نے بھی ''قیصر ہند'' کا میڈل لوٹا دیا جو ان کی سماجی خدمات کے صلے میں انھیں ملا تھا۔ آزادی کے عہد نامے پر دستخط کرنے والے رضا کاروں میں سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ 1930 کے مشہور 'نمک ستیہ گرہ' کے دوران وہ مہاتما گاندھی جی کے شانہ بہ شانہ رہیں۔ اور گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد وہ اس تحریک کی قیادت اس وقت تک کرتی رہیں جب تک کہ وہ دیگر ساتھیوں کے ساتھ خود گرفتار نہ ہو گئیں۔

سروجنی نائیڈو کے اس عزم اور حوصلہ نے آزادی کے متوالوں کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ ان لوگوں کے اندر نیا جوش پیدا ہو گیا۔ اسی دوران 8 اگست 1942 کو کانگریس کے بمبئی اجلاس میں گاندھی جی نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک زور پکڑنے لگی۔ ''کرو یا مرو'' کا نعرہ بلند ہونے لگا۔ 8 اگست کی آدھی رات کو گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تقریباً دو سال بعد گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے رہنما ایک ایک کر کے رہا کیے گئے۔

آزادی کے بعد سروجنی نائیڈو کو اتر پردیش کا گورنر بنایا گیا اور وہ اپنے سرکاری فرائض بڑی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے لگیں۔ 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ سروجنی نائیڈو نے ان الفاظ میں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ''ان کے لیے عظیم موت صرف یہی تھی ذاتی سوگ منانے کا وقت ختم ہوا اب وقت ہے کھڑے ہو کر یہ کہنے کا جن لوگوں نے گاندھی جی کو اپنا کام کرنے سے روک دیا ان کی چنوتی اب ہم قبول کرتے ہیں۔''

سروجنی نائیڈو نے عورتوں کی آزادی، مساوات اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے نئی نسل میں بیداری اور شعور پیدا کیا۔ چنانچہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس جیسی تنظیم کا قیام انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے وہ ہمیشہ فعال رہیں اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے وہ پریشان ہو جاتی تھیں، وہ تعلیم نسواں پر بہت زور دیتی تھیں۔ ان کے مطابق ''تعلیم حاصل کر کے ہی ایک عورت اپنے گھر اور سماج کے لیے بہترین کام کر سکتی ہے۔'' عورتوں کی فلاح سے غیر معمولی دلچسپی کے باعث سروجنی نائیڈو کے یوم ولادت یعنی 13 فروری کو ''یوم خواتین'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 'موت سے کس کو رستگاری ہے' کے مصداق 2 مارچ 1969 کو اس عظیم مجاہدۂ آزادی کا انتقال ہو گیا۔

□□□

K-78/A Ist Floor
Batla House, Okhla
New Delhi-110025

بیرونی ممالک میں ''اردو دنیا'' کی سالانہ شرحِ خریداری

ممالک	بحری ڈاک آرڈینری	بحری ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	352 روپے	460 روپے	640 روپے
نیپال	280 روپے	484 روپے	568 روپے	772 روپے
بنگلہ دیش	232 روپے	316 روپے	400 روپے	604 روپے
دیگر ممالک	280 روپے	460 روپے	664 روپے	844 روپے

رشید انجم

اسد بھوپالی

1949 میں بھوپال سے جو پہلا پیشہ ور شاعر ممبئی پہنچا، وہ اسد بھوپالی تھے۔ ممبئی کے فضلی برادران اپنی فلم کمپنی کے لیے ایس. ایف. حسنین کی ہدایت میں فلم "دنیا" بنا رہے تھے۔ اس کے ایک نغمہ نگار آرزو لکھنوی بھی تھے۔ انھوں نے دو نغمے لکھے اور اچانک وہ پاکستان چلے گئے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے فضلی کو اچھے نغمہ نگار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سکم چند کاپڑیا (بھوپال کے سنیما ہاؤس بھارت ٹاکیز اور بھوپال ٹاکیز کے مالک) جو اس وقت ممبئی میں تھے، انھیں جب فضلی کی پریشانی کا علم ہوا تو انھوں نے فضلی کو مشورہ دیا کہ بھوپال میں بہترین شاعر ہیں، مشاعرہ رکھ لیا جاتا ہے، جو آپ کو پسند آئے، اسے آپ ممبئی لے آئیں۔ فضلی تیار ہو گئے۔ سکم چند کاپڑیا نے 5 مئی 1949 کو بھوپال ٹاکیز میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔ فضلی اور حسنین نے شرکت کی۔ دیگر شعرا کے علاوہ اسد بھوپالی نے بھی اپنی ایک مشہور انقلابی نظم سنائی تو سارا ماحول واہ وا میں تبدیل ہو گیا۔ مشاعرے کے بعد کچھ لوگ اسد بھوپالی کو کاندھوں پر اٹھائے ان کی قیام گاہ تک لے کر آئے۔ دوسرے دن صبح دس بجے ایک شخص نے اطلاع دی کہ بھوپال ٹاکیز کے منیجر مصباح صاحب نے بلایا ہے۔ اسد بھوپالی مصباح صاحب سے ملے تو انھوں نے فلم میں گانے لکھنے کی دعوت دے دی۔ اسد بھوپالی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ انھوں نے ہاں کہی تو انھیں پانچ سو روپے بطور پیشگی دے کر ممبئی پہنچنے کی گزارش کی گئی۔ اسد بھوپالی سب سے رخصت ہو کر 18 مئی 1949 کو ممبئی ایسے گئے کہ پھر موت ہی انھیں لے کر بھوپال لوٹی۔

فلم "دنیا" میں کرن دیوان، ثریا اور یعقوب نے اداکاری کی تھی اور سی. رام چندر نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ آرزو لکھنوی کے علاوہ دیپک، شمس الہدیٰ بہاری اور طالب الٰہ آبادی نے بھی گیت لکھے تھے۔ اسد بھوپالی سے باقی نغموں کے لیے معاہدہ ہو گیا جن کی وجہ سے فلم رکی ہوئی تھی۔ اسد بھوپالی نے اس فلم میں دو گیت لکھے تھے محمد رفیع کی آواز میں "روتا ہے تو چپکے چپکے رو، آنسو نہ بہا آواز نہ ہو" اور "ارمان لٹے دل ٹوٹ گیا، دکھ درد کا ساتھی چھوٹ گیا" ثریا کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔ 1950 میں انھیں حسن لال بھگت رام کی موسیقی میں فلم "آدھی رات" میں دو گیت لکھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ "ادھر تو آؤ سرکار، کسی کی جیت کسی کی ہار" اور "دل ہی تو ہے تڑپ گیا، درد سے بھر نہ آئے کیوں" ان دونوں گیتوں کو لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ اسی سال انھیں فلم "نزدوش" میں موسیقار شیام سندر کی موسیقی میں نغمے لکھنے کا موقع ملا جنھیں لتا منگیشکر اور شمشاد بیگم کی دل کش آواز حاصل ہوئی۔

1951 میں بی. آر. چوپڑا اپنی ہدایت میں فلم "افسانہ" اشوک کمار، وینا اور جیون کو لے کر بنا رہے تھے، حسن لال بھگت رام موسیقار تھے۔ اس فلم میں کل نو گانے تھے جن میں سے چھ گانے اسد بھوپالی نے لکھے تھے اور یہ چھ گانے شمشاد بیگم، مکیش اور لتا منگیشکر کی آواز میں زبردست مقبول ہوئے تھے۔

1. کہاں ہے تو میرے سپنوں کے راجا، جوانی آ گئی ہے اب تو آ جا
2. وہ آئے بہاریں لائے بجی شہنائی
3. قسمت بگڑی دنیا بدلی پھر کون کسی کا ہوتا ہے
4. محبت کا دونوں کے دل پر اثر ہے، نہ ہم کو خبر ہے نہ ان کو خبر ہے
5. آج کچھ ایسی چوٹ لگی ہے ٹوٹ گیا پیمانہ دل کا
6. وہ پاس بھی رہ کر پاس نہیں، ہم دور بھی رہ کر دور نہیں

ان گیتوں نے سارے ملک میں دھوم مچا دی۔ بی. آر. چوپڑا کی فلم "افسانہ" میں اتنے ہٹ گانے لکھنے کے باوجود اس سال انھیں صرف ایک اور فلم "راج پوت" ملی جو زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔

زندگی جدوجہد بھری تھی۔ مجروح، جاں نثار اختر، خمار، راجیندر کرشن، مدھوک، پریم دھون اور کئی دیگر شاعر اس جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسد بھوپالی جس ہاسٹل میں رہتے تھے اسی میں ساحر لدھیانوی بھی فلم نگری میں اپنی قسمت آزمانے کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ اکثر دونوں ساتھ چہل قدمی کے لیے شام کو ممبئی کی سڑکوں پر نکلتے اور مستقبل کی سنہری تابناکی کو تلاش کرتے ہوئے ناکام واپس آ جاتے تھے۔

1954 میں نانو بھائی وکیل کی فلم "گل بہار" میں اسد بھوپالی کو جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور شیون رضوی جیسے نغمہ نگاروں کا ساتھ ملا۔ انھوں نے اس فلم میں صرف ایک نغمہ "کلیوں کو چوموں میں تاروں سے کھیلوں" لکھا تھا جسے خیام کی موسیقی میں مبارک بیگم نے گایا تھا۔ اس فلم میں دھنی رام اور خیام کی جوڑی تھی۔ کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر نے بھی ایک ایک ہی گیت لکھا تھا جب کہ شیون رضوی کے دو گیت تھے۔

اسد بھوپالی علم عروض سے واقف مستند شاعر تھے اسی لیے ان کے گیتوں

میں راگ کی بندشوں کے ساتھ دلنشیں نغمگی ملتی ہے جو روح میں اتر جاتی ہے۔ انھیں گیت لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ گیت کے مکھڑے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھ لیا کرتے تھے اور جب کسی فلم کی سچویشن ملتی تو مکھڑے کو چن کر اس میں انترا جوڑنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ موسیقی کی ہر بندش پر آسانی سے گیت لکھ دیا کرتے تھے۔

1949 سے 1990 تک تقریباً سو فلموں میں انھوں نے کوئی چار سو گیت لکھے۔ سی. رام چندر، حسن لال بھگت رام، خیام، ہنسراج بہل، لچھی رام، دھنی رام، دتا رام، شیام، سندر، شورام، ماسٹر مکھرجی، این. دتا، نوشاد، اے. آر. قریشی، چترگپت، روی، سی. ارجن، سونک اومی، راج کمل، لالہ ستار، ہیمنت کمار اور کلیان جی آنند جی جیسے موسیقاروں کی موسیقی میں اپنے نغموں کی ایک لالہ زار دنیا آباد کی۔ گنیش اور اوشا کھنہ کے ساتھ انھوں نے سب سے زیادہ فلموں میں گیت لکھے۔ لکشمی کانت پیارے لال جیسی موسیقار جوڑی نے انھیں آنند بخشی کے ساتھ اپنی فلموں میں گیت لکھنے کا موقع دیا۔ ''آیا طوفان''، ''پارس منی''، ''لٹیرا''، ''چھیلا بابو'' وغیرہ فلموں کے نغموں کی دھنیں لکشمی کانت پیارے لال کی بنائی ہوئی ہیں۔ ''پارس منی'' کے گیتوں ''وہ جب یاد آئے بہت یاد آئے'' (رفیع۔ لتا) اور ''ہنستا ہوا نورانی چہرہ'' (لتا۔ کمل باروٹ) نے تو اپنے وقت میں مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس فلم کا معاوضہ انھیں دس ہزار روپیہ ملا تھا۔ اس معاوضے سے ان کے چھوٹے بھائی اور اردو ادب کی معروف شخصیت قمر جمالی نے اسلام پورہ بھوپال میں واقع ان کے مکان کو از سرِ نو تعمیر کرا کر اسد بھوپالی کی پہلی اہلیہ عائشہ بی کے نام رجسٹری کرا دیا تھا۔ یہ مکان آج بھی موجود ہے جس میں اب ان کے بڑے بیٹے تاج محمد خاں رہتے ہیں۔ پہلی اہلیہ سے دو بیٹے تاج، تابش اور چھ بیٹیاں ہیں۔ اسد بھوپالی نے دوسری شادی ممبئی میں کی تھی۔ ان کی دوسری بیوی سے صرف ایک بیٹا غالب اسد ہے جس نے فلمی دنیا میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ اسد بھوپالی کی پہلی اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے، دوسری اہلیہ باحیات ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کے ساتھ ان کی آخری فلم ''رنگ بھوی'' تھی جو 1992 میں ان کی موت کے بعد ریلیز ہوئی تھی۔

اس فلم میں ایک گیت کا مکھڑا ہے ''پی کے شنکرجی کی بوٹی، کھل گئیں انکھیاں نندیا ٹوٹی''۔ یہ گیت بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ کے. آصف مرحوم کی آخری فلم ''محبت اور خدا'' میں نوشاد صاحب نے اسد بھوپالی سے صرف ایک نغمہ لکھوایا تھا جسے طلعت محمود نے کورس کے ساتھ گایا تھا اور فلم میں سنجیو کمار (مجنوں) پر فلمایا گیا تھا۔

1989 میں جب سورج بڑجاتیہ نے اپنی مشہور فلم ''میں نے پیار کیا'' موسیقار رام لکشمن کے ساتھ شروع کی تو اسد بھوپالی اس فلم کے سب سے اہم نغمہ نگار تھے۔ اس فلم کا اہم ترین گیت ''کبوتر جا جا، کبوتر جا جا جا'' اسد بھوپالی نے لکھا تھا اور دونوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اس گیت کو مقبولیت ملی تو سورج بڑجاتیہ اسد بھوپالی کو ایک فلیٹ اور ماروتی کار دیں گے۔ فلم ریلیز ہوئی، ہٹ ہوئی اور یہ گیت بھی نہ صرف فروخت کے لحاظ سے بلکہ مقبولیت کے لحاظ سے بھی سپرہٹ ہوا مگر مقدرات کا مالک کچھ اور ہی فیصلے کر چکا تھا۔ اسد بھوپالی پریمیئر میں شریک ہونے سے محروم رہ گئے۔ مرض کا ایسا حملہ ہوا کہ وہ بستر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بیماری نے حد سے تجاوز کیا تو ان کے دونوں بیٹے اور داماد انھیں بھوپال لے آئے۔ ایک عرصے تک وہ زیرِ علاج رہے اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ افاقے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ ان کے بیٹوں نے ممبئی کے کئی چکر لگائے۔ سورج بڑجاتیہ سے ملے مگر انھوں نے صرف اپنا وعدہ ہی فراموش نہیں کیا، ان کے گیتوں کی رائلٹی تک نہیں دی۔ فلم فیئر نے 1990 میں اس گیت کو سال کا بہترین گیت قرار دے کر اسد بھوپالی کو جب ایوارڈ کے لیے مدعو کیا تو وہ ایوارڈ بھی سورج بڑجاتیہ نے وصول کر لیا۔ اسد بھوپالی کی بیماری پر انھوں نے ایک لفظ ہمدردی کا نہیں کہا جس کے نغمے نے فلم کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

10 جولائی 1921 کو منشی احمد خاں کے یہاں جو سب سے پہلا بیٹا پیدا ہوا اس کا نام اسد اللہ خاں رکھا گیا۔ اسے فارسی، عربی، اردو اور انگریزی کی تعلیم دی گئی اور دنیا نے اسے اسد بھوپالی کے نام سے پہچانا۔ 28 سال کی عمر میں ممبئی جا کر فلموں میں نغمہ نگار بنے، ساری زندگی جدوجہد میں بسر ہوگئی۔ ہر فلم کی ریلیز ایک خوش آئند خواب آنکھوں میں سجاتی رہی مگر قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہوئی۔ 50 سال کی اس جہدِ مسلسل کا صلہ ملنے کا جب وقت آیا تو بسترِ مرگ تیار ہو چکا تھا۔ بیٹے، بیٹیوں، شریکِ زندگی، دامادوں، نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کی خدمت، تیمارداری اور دعائیں سب بے اثر ثابت ہوئیں۔ 9 جون 1990 کی رات کے بکھراں سناٹے میں اپنے وقت کا معروف شاعر اور نغمہ نگار بہت خاموشی سے راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ 1952 میں بنی فلم ''موتی محل'' میں لکھے اپنے ہی گیت:

جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہوگا
دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا

کے حقیقی معنوں میں ملبوس چار کاندھوں پر سوار قبرستان کے ایک گوشے میں دفن ہو گئے۔ بھوپال کا کوئی شاعر، کوئی ادیب، کوئی سماجی، سیاسی رہنما (ایک دو کو چھوڑ کر) نہ تو ان کے جنازے میں شریک تھا اور نہ کوئی آج بتا سکتا ہے کہ اسد بھوپالی کہاں دفن ہیں۔ صرف ان کے بیٹے تاج محمد فاتحہ پڑھنے اپنے والدین کی قبروں پر جاتے ہیں۔

□□□

پتہ:
47, Kashana
Islampura, Itwara
Bhopal-462001 (M.P.)

شائق احمد یحییٰ

جرمنی کا سفر

جرمنی کا شمار دنیا کے ان آٹھ ترقی یافتہ ممالک جنھیں G-8 کہا جاتا ہے، میں ہوتا ہے۔ بین الاقوامی پرندوں کی 24 ویں کانگریس میں شمولیت کی غرض سے میں نے یہاں کا سفر اگست 2006 میں کیا تھا۔ مغربی یوروپ میں فرانس کے بعد جرمنی دوسرا سب سے بڑا ملک ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی اس کی حیثیت مسلم ہے۔ ہٹلر کی آمرانہ سرگرمیاں، جنگ وجدال اور اس کی پوری دنیا پر حکومت کی خواہش، جنگ عظیم اول اور دوم میں جرمنی کا رول اور دیگر وجوہات سے بھی جرمنی مشہور رہا ہے۔ جرمنی یوروپ کا سب سے زیادہ آبادی والا ملک بھی ہے جو 1990 تک مشرقی اور مغربی جرمنی میں منقسم تھا اور برلن شہر کی 25 کلومیٹر لمبی دیوار دونوں ملکوں کو تقسیم کرتی تھی۔ برلن دیوار کا جرمنی کی ثقافت اور معاشیات پر گہرا اثر تھا۔ موجودہ جمہوریہ جرمنی 16 صوبوں پر مشتمل تقریباً 34 لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ پڑوسی ملکوں میں شمال میں ڈنمارک، جنوب میں آسٹریا، مغرب میں فرانس و بیلجیم اور ہالینڈ جب کہ مشرق میں پولینڈ واقع ہے۔ اس طرح جائے وقوع کے لحاظ سے جرمنی یوروپ کا دل کہلاتا ہے۔ عام طور سے جرمنی پانچ ضمنی جغرافیائی خطے میں بانٹا جا سکتا ہے۔ جن میں میدانی حصے، جھیل و دریا پہاڑیاں اور وادیاں واضح ہیں۔ نارتھ اور بالٹک سمندر جرمنی کو بحری دنیا سے جوڑتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا یوروپ کی ٹھنڈی اور برفانی ہواؤں پر مشتمل ہے۔ یہاں بارش ہر موسم میں ہوتی ہے۔ اور 83 ملین (8 کروڑ 3 لاکھ) نفوذ پر مشتمل یہ عظیم ملک کئی لحاظ سے دلچسپ اور سیر کے لائق ہے اس لیے تمام سال دنیا کے ہر خطے سے سیاح یہاں پر سیر کے لیے آتے ہیں۔ جرمنی صرف خوبصورت مناظروں کا ہی ملک نہیں یہاں کے لوگ بے حد بااخلاق، خوب سیرت اور خوبصورت ہوتے ہیں جس کا اندازہ مجھے یہاں کے سفر سے قبل نہیں تھا۔ ان دس دنوں کے سفر کے درمیان ہمارا زیادہ وقت جرمنی کے دوسرے سب سے بڑے اور مشہور شہر ہمبرگ میں گزرا مگر ایک دن میں نے برلن کی بھی سیر کی۔ اس سفر کی روداد قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔

بین الاقوامی پرندوں کی یہ کانگریس ہر چار سال پر ہوتی ہے اور 2002 میں بیجنگ (چین) میں یہ طے پایا تھا کہ 2006 کا اجلاس ہمبرگ میں ہوگا۔ لہٰذا جرمنی جانے کا قصد تو پہلے ہی کر چکا تھا مگر میرے مقالے کی شمولیت کی منظوری دسمبر 2005 میں آجانے کے بعد جرمنی کے سفر کی باضابطہ تیاری شروع ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سفر کے آدھے اخراجات کی منظوری کے بعد انڈین نیشنل سائنس اکادمی نے پندرہ ہزار روپے کی امداد کی جب کہ ہمبرگ میں کانفرنس والوں نے قیام کی سہولت فراہم کردی۔ دلی کی جرمنی ایمبیسی ویزا دینے کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ ضروری کاغذات فراہمی کی لمبی لسٹ ہے جسے پورا کرنا لازمی ہے۔ ٹکٹ وغیرہ کے علاوہ قیام کی مدت تک کا ہیلتھ انشورنس بھی لینا ضروری ہوتا ہے۔ یہ پابندی میں نے اب تک کسی سفر کے لیے نہیں جھیلی تھی۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ ویزا کانفرنس منعقد ہونے سے دو ماہ قبل ہی دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ میں ہر سال گرمیوں میں امریکہ چلا جاتا ہوں اور جولائی کے آخر میں واپسی ہوتی ہے اس لیے ویزا میں اپریل میں ہی لے لینا چاہتا تھا۔ میری درخواست پر ویزا آفیسر نے بطور خاص میرے لیے یہ چھوٹ دے دی۔ 11 اگست کو امریکہ سے ہندوستان لوٹا اور 12 اگست کو ایر انڈیا اور آسٹیریا ایرلائن کی مشترکہ پرواز سے ویانا ہوتا ہوا 13 اگست کی صبح ہمبرگ پہنچ گیا۔ ہوائی جہاز میں بیشتر عملے آسٹیریا کے مہمان نواز تھے۔ دہلی سے ویانا کا سفر نہایت آرام دہ رہا، گوکہ سات گھنٹے کی پرواز تھی مگر مقامی وقت میں ہندوستان اور یوروپ میں 4 گھنٹے کی کم وبیش ہونے کی وجہ سفر کی تھکن بالکل نہیں ہوئی۔ ویانا ہمبرگ کا سفر ایک چھوٹے جہاز میں ایک گھنٹہ بیس منٹ میں طے ہوا۔

ہوائی اڈے پر منتظمین کے ممبران کے موجود ہونے کی اطلاع پہلے سے تھی لہٰذا ان سے رابطے کے بعد اطمینان ہوا۔ ان لوگوں نے میرے قیام کا پتہ کر وہاں تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ ہمبرگ ہوائی اڈہ چھوٹا مگر خوبصورت اور بے حد معروف ہے۔ چونکہ پاسپورٹ پر اندراج ویانا میں ہی ہو چکا تھا، ہمبرگ میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ دراصل جرمنی کا جو ویزا مجھے ملا تھا اسے Schengener کہتے ہیں جس کے تحت یوروپ کے آٹھ ملکوں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ان ملکوں میں سے کسی بھی ملک میں اگر مسافر داخل ہو جائے تو پھر دوسرے ملکوں میں سفر کے لیے مزید کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ چونکہ میرا سامان مختصر تھا ہوائی اڈہ سے 15 منٹ کی بس اور لوکل ٹرین کے 40 منٹ کے سفر کے بعد Famsen اسٹیشن پر پہنچا جہاں سے ٹیکسی لے کر بارن کروگ

اپنے میزبان روتھ موس کے گھر دن کے دس بجے بخیریت تمام پہنچ گیا۔ میرے میزبان روتھ موس کا گھر نہایت کشادہ، آراستہ اور پرسکون علاقے میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنے مکان کا اوپر کا ایک بڑا کمرہ ساری آسائشوں کے ساتھ مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور گاہے گاہے یہاں کئی لوگ قیام کرتے ہیں۔ جرمنی میں اکثر لوگ اس طرح کے مسافروں کی بے معاوضہ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اس کانفرنس کے تقریباً 85 مندوبین اس طرح کے فری گیسٹ روم میں قیام پذیر تھے۔ ہندوستان کے 20 مندوبین میں سے زیادہ تر ایسے ہی مکانوں میں رہ رہے تھے اور سبھی اپنے میزبان کی اخلاقی پاسداری کا ذکر کر رہے تھے۔ جرمنی میں تقریباً 34 فیصد لوگ وولینٹیرس کرتے ہیں اور ملک کی ترقی میں خاموشی سے بہت بڑا رول نبھاتے ہیں۔ کاش ایسا جذبہ ہمارے ملک میں بھی ہوتا؟

کانفرنس کا رجسٹریشن اسی دن شام کو ہمبرگ کے مشہور کانگریس سینٹر میں ہوا اور بقیہ کاروائی بھی اگلے سات دنوں تک اسی بلڈنگ میں ہوتی رہی۔ 87 ملکوں سے پندرہ سو مندوبین شرکت کر رہے تھے اور باوجود اتنے لوگوں کے یہاں کا انتظام اتنا اچھا تھا کہ کسی دن بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ کانگریس کی کاروائی کا پروگرام قبل سے چھپا ہوا تھا۔ اور کوئی تبدیلی ہوتی تو اس کا اعلان صبح میں ہو جاتا اور نوٹس بورڈ پر بھی لکھ دیا جاتا۔ صبح 8.30 بجے سے رات کے 9:30 بجے تک اس تین منزلہ عمارت کے 11 بڑے کمروں میں مقالے پڑھے جاتے۔ دو منزلوں کے ہال میں پوسٹرس کی نمائش تھی اور سطحی منزل کے ایک بڑے ہال میں کتاب اور پرندوں کے مشاہدے کے لیے کیمرے، بائی نوکولر، دور بین، رنگس، پینٹنگ وغیرہ کے کئی اسٹال لگے ہوئے تھے۔ میں اپنی دو کتابوں کی دس دس کاپیاں لے گیا تھا جو ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ کانفرنس 13 سے 19 اگست تک چلتی رہی، درمیان میں 17 اگست خالی دن رکھا گیا تھا تاکہ مندوبین چاہیں تو ملک کے دیگر علاقوں کی سیر یا کسی خاص جگہ جا کر پرندوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ کانفرنس کے دنوں میں بھی مقامی پرندوں کے مشاہدوں کے لیے علی الصبح یا پھر دیر سہ پہر میں مندوبین کو کئی خوبصورت مقامات کی سیر کرائی گئی۔

کانگریس کے درمیان میں اس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بھی ہوتی رہی۔ مجھے ہندوستان کا نمائندہ اور ایشیا کی ورکنگ کمیٹی کا کوآرڈینیٹر بھی مقرر کیا گیا۔ 2010 کی کانگریس کے دو دعویدار تھے، برازیل اور فن لینڈ۔ فیصلہ برازیل کے حق میں ہوا اور اس طرح 2010 میں برازیل کے سفر کا جواز بن گیا جہاں جانے اور آمیزن جنگلوں کی سیر کی میری دیرینہ خواہش ہے:

ع یار زندہ، صحبت باقی

ذیل میں ہمبرگ اور برلن کے چند مشہور سیاحی مرکزوں کا ذکر ہے جنھیں دیکھنے کا موقع ملا۔

ہمبرگ:

ہمبرگ ایک نہایت خوبصورت اور منظم شہر ہے۔ جسے بجا طور پر Waterfront سٹی کہتے ہیں کیونکہ شہر کے اندر زمین دوز ریلوے، بس اور موٹر کار کے علاوہ اسٹیمروں اور جہازوں کی روانی ہمہ دم رہتی ہے۔ السٹر جھیل و دریا کے بعض علاقے اتنے گہرے ہیں کہ Queen Marry II جیسا بڑا جہاز بھی آسانی سے شہر کے اندر آکر لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ ہمبرگ کا بندرگاہ Harbour سیاحوں کا مشہور مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ بحری جہازوں اور کشتیوں کی آماجگاہ بھی ہے۔ سہ پہر سے رات تک یہاں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے اور پندرہ یورو (تقریباً سات سو روپے) کے ٹکٹ سے ڈیڑھ گھنٹے کی آبی سیاحت ہمبرگ کی اچھی خاصی سیر کرا دیتی ہے۔ دو منزلہ بس سے بھی شہر کی سیاحی نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہے۔ ہر بس میں ایک گائیڈ ہوتا ہے جو خاص جگہوں، عمارتوں اور گرجا گھروں کی تواریخ اور دیگر معلومات فراہم کرتا ہے۔ ہمبرگ شہر کا نام ایک قدیم محل "ہمابرگ" کے نام سے ماخوذ ہے۔

یوں تو ہمبرگ ایک ہزار دو سو سال پرانا شہر ہے لیکن پچھلے ایک صدی میں اس کی وسعت اور گہما گہمی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور اب ہافن شہر کے درمیان دریا کے پار جدید طرز پر بسایا جا رہا ہے۔ ہمبرگ بجا طور پر دنیا کے سیاحوں، خاص کر یوروپ کے سیاحوں کا محبوب ترین شہر ہے۔ یوروپین یونین بننے اور آمد و رفت کی سہولت کے بعد یہاں لوگ جوق در جوق آنے لگے ہیں۔ شہر میں نقل و حرکت کے لیے زمین دوز ٹرین اور بس کا جال بچھا ہوا ہے۔ نقل و حمل کا انتظام اتنا اچھا ہے کہ اتنی آبادی کے باوجود ٹریفک جام بالکل نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مسافر اگر شہر کی ٹریفک کے نقشہ کا استعمال کرے تو بڑی آسانی سے منزل مقصود تک جا سکتا ہے۔ ایسے نقشے مفت دستیاب ہوتے ہیں۔ ہمبرگ یوروپ کا سبزہ زار شہروں میں ایک ہے۔ ہوائی پرواز کے درمیان شہر پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اتنا خوبصورت نظارا ملتا ہے کہ جی کرتا ہے کہ یہاں کے ہو جائیں۔ روشنی کی چکاچوند میں رات میں شہر کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ 2020 تک اس شہر کو اور بھی خوبصورت اور کشادہ بنانے کا پلان ہے تاکہ سیاحوں کی کشش برقرار رہے۔ ماحولیاتی صفائی کا خاص دھیان رکھا گیا ہے تمام قومی شاہراہوں، ریلوے اسٹیشن پر، بس اڈے، پکنک کی جگہیں، پارک و گارڈن نہایت صاف ستھرے ہیں۔ ہمبرگ میں انگریزوں کا یوروپ کا سب سے بڑا قبرستان جس کا رقبہ 45 مربع کلومیٹر ہے اور 250 قسم کے پرندے یہاں رہتے ہیں۔ قبرستان کے اندر درخت اور خوبصورت جھاڑیوں

اور پھول کی کیاریوں کی اتنی بہتات ہے کہ پورا قبرستان ایک بہت بڑا پارک بن گیا ہے۔ عین شہر کے کنارے اتنا پرسکون ماحول دنیا میں شاید کہیں اور نہ ہو۔ ہمبرگ کے سیاحوں کے لیے یہ ایک لازمی جگہ ہے اور چونکہ یہاں پرندوں کی بہتات ہے ہم نے ایک سہ پہر یہاں کی بھرپور سیر کی مگر اس قبرستان کو پوری طرح دیکھنے کے لیے سارا دن بھی ناکافی ہے۔

ہمبرگ نیشنل آبی پارک یہاں کی دوسری قابل دید جگہ ہے۔ جو قدرتی مناظر اور خوبصورتی سے بھرپور ہے۔ یہاں حیاتیاتی تنوع اور Ecology کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ہمبرگ میں کئی آفاقی قدرتی ورثہ بھی ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے قدرتی ورثہ اور ماحولیاتی نظام کو متوازن رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جرمنی میں پانچ ہزار مضافاتی مراکز ہیں جب کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں صرف پانچ سو ایسی سینکچوریاں ہیں۔ جرمنی میں زمین کا دس فیصد زمینی حصہ محافظتی سسٹم کے لیے مختص ہے جب کہ ہندوستان میں صرف چار فیصد زمین ہی ایسے نظام کے زیرنگرانی ہے اور جو ہے وہ بھی تیزی سے زوال پذیر ہے۔

مارش برڈ سینکچوری

کیمرا اور دوربین وغیرہ کی مشہور کمپنی کارل زائس کے زیرنگرانی یہ نشیبی علاقہ اور اس کا تحقیقی مرکز پرندوں کے مشاہدین کے لیے ایک خاص مقام ہے۔ مرغابیاں، ہنس، چاہا، بگلے وغیرہ کو خوبصورت واچ کیبن سے بہت نزدیک سے دیکھا جا سکتا ہے اور تصویریں لی جا سکتی ہیں۔ یہاں پرندوں پر پابندی سے تحقیق بھی ہوتی ہے۔ نقل مکانی پرندوں پر بھی کافی کام ہوا ہے۔ قدرتی مناظر اور پرندوں کے مشاہدین کے لیے یہاں کی سیر جزولاینفک ہے۔ کانگریس کے درمیان تقریباً سبھی مندوبین کو باری باری سے یہاں کی سیر کرائی گئی۔ وسط شہر سے یہاں کی دوری 45 کلومیٹر ہے۔ وہاں جاتے ہوئے ایک چوراہے پر ہم نے گاندھی جی کی ایک پرکشش اور آراستہ قدآدم تصویر دیکھی۔ اتفاق سے وہ دن ہماری آزادی کا دن بھی تھا 15 اگست اور چند لمحوں کے لیے میں ہندو پاک کی آزادی کے شہیدوں کی یاد میں کھو گیا۔ کاش ہم لوگ اپنی آزادی کا صحیح فائدہ اٹھاتے اور فرقہ وارانہ تعصب سے پاک ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے تو ہمارے ملک کے کئی شہر شاید ہمبرگ سے بھی زیادہ منظم اور خوبصورت ہوتے۔

پرانا بوٹانیکل گارڈن:

اونچے اونچے درخت اور خوبصورت پھول کی کیاریوں اور پرانی جھیل پر مشتمل یہ گارڈن مقامی باشندوں اور سیاحوں کی مشہور تفریح گاہ ہے۔ چونکہ یہ وسط شہر سے نزدیک ہے یہاں آنا بہت آسان ہے۔ دور دراز جانے والی تیز گام ریل گاڑیوں کا پرہجوم سنٹرل ریلوے اسٹیشن اور کانگریس سینٹر بھی بوٹانیکل گارڈن سے نزدیک ہے۔

البی دریا کا ساحل:

یہ ساحل بھی سیاحوں کا محبوب علاقہ ہے، جس کی سیر کے بغیر ہمبرگ کی سیر ادھوری ہے۔ ساحلی پرندوں کی موجودگی سے یہ جگہ پرندوں کے مشاہدین کے لیے بھی پرکشش ہے۔ ایک مصنف نے تو یہاں آنے والی سڑک کو دنیا کی حسین ترین سڑک لکھا ہے۔ البی دریا کی گہرائی کافی ہے لہٰذا اس پر بڑے بڑے جہاز تیرتے ہیں اور شمالی سمندر جانے کے لیے یہ دریا آبی شاہراہ کا کام کرتا ہے۔ ہمبرگ سے تقریباً 20 کلومیٹر بعد یہ میٹھے پانی کا دریا کھارے پانی کا ہو جاتا ہے اور پھر سمندر میں مل جاتا ہے۔ مشہور قدیم شہر التونہ البی ساحل سے متصل ہے۔ اب بھی وہاں مچھلیوں کا بڑا بازار لگتا ہے۔ چونکہ یہاں مذہبی آبادی ہمیشہ سے رہی، پڑوسی ملکوں سے مذہبی پیشوا یہاں آتے رہے جس کا اثر ہمبرگ کی ثقافت پر بھی ہے اور یہاں اب بھی کیتھولک عیسائیوں کا کافی اثر ہے۔

ٹاؤن ہال:

دو تین قدیم عمارتوں پر مشتمل ٹاؤن ہال ہمبرگ کا ایک خوبصورت اور مصروف علاقہ ہے جہاں دن بھر اور دیر رات تک سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے۔ کھلے لان میں نسبتاً سستے ریسٹورینٹ اور بار یہاں کی خاص کشش ہے۔ کئی بڑے بڑے بازار اور گرجا گھر اس علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ سیاح دیر رات تک یہاں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ السٹر (Alster) نامی ایک بڑی جھیل یہاں سے نکلتی ہے جس میں سیاحی کشتی زائرین کو دور دور تک سیر کے لیے لے جاتی ہے۔ درحقیقت السٹر جھیل ہمبرگ میں سیاحی کی روح رواں ہے۔ تصور کریں کہ زمین کے اندر ٹرین کا جال، سڑک پر بس اور کار کی ہماہمی اور لب سڑک جھیل کے کنارے پرکشش دخانی اسٹیمر کی سواری، سبھی مل کر کیا پررونق دلچسپ سماں پیش کرتے ہوں گے۔ زمین دوز اسٹیشن سے اوپر آتے ہی دنیا بدل جاتی ہے اور سماں دیدنی ہو جاتا ہے۔ خوبصورت لڑکیاں، جوان جوڑے، کچھ ڈھکے کچھ کھلے لباسوں میں ملبوس، اپنے آپ میں منہمک لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

سینٹرل ریلوے اسٹیشن:

ہمبرگ کا سینٹرل ریلوے اسٹیشن اور اس سے متصل سینٹرل بس اڈا کافی مصروف علاقہ ہے جہاں صبح و شام ممبئی کے چرچ گیٹ یا وی۔ٹی۔ جیسا سماں ہوتا

ہے۔ ہجوم کا ہجوم ایک ٹرین سے اترتا ہے دوسرے پر سوار ہوتا ہے، ساری خلقت دوڑتی بھاگتی نظر آتی ہے مگر کوئی شور شرابہ نہیں ہوتا۔ اسٹیشن کے اندر اور اطراف میں بڑی بڑی دکانیں پھولوں کے بازار، کھانے کے ہوٹل نہایت سجے صاف ستھرے اور پرسکون ہوتے ہیں۔ گوکہ زیادہ تر لوگ جرمن زبان میں بات کرتے ہیں مگر انگریزی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ خاص کر نوجوان لوگ زیادہ تر انگریزی میں بات کر لیتے ہیں۔ انگریزی سے نابلد بھی بڑی شائستگی سے کسی دوسرے سے معلوم کرکے مسافروں کی مدد کر دیتے ہیں۔ یہاں کی ٹرین اور بس کا ٹکٹ ایک ہی ہوتا ہے اور کرایہ بھی بہت مناسب ہے۔ ہمارے لیے ایک ہفتے کا فری پاس کانگریس کے منتظمین نے فراہم کر دیا تھا جس سے بہت سہولت رہی۔ خاص کر کانفرنس کے آخری دن جب کہ کسی نے سینٹرل اسٹیشن پر بم کی موجودگی کی جھوٹی اطلاع پھیلا دی تھی اور تین گھنٹوں کے لیے وہ سارا علاقہ بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے ٹرین بدل کر دوسرے راستوں کے ذریعہ سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے علاقے سے احتراز کرتے ہوئے اپنی قیام گاہ تک کا سفر طے کیا تھا۔ اس طرح غیر ارادی طور پر شہر کے بہت سے علاقوں کی سیر ہوگئی۔ ریلوے پاس کی وجہ سے ٹکٹ لینے کی دقت سے بھی نجات رہی کیونکہ سبھی اسٹیشن پر ٹکٹ لینے کے لیے مشین لگی ہوتی ہے جس سے ٹکٹ لینے کے لیے کافی مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر کھلے پیسوں کا بھی مسئلہ رہتا ہے۔ بسوں میں ڈرائیور ہی کنڈکٹر کا کام کرتے ہیں اور مطلوبہ ٹکٹ فراہم کر دیتے ہیں۔ مقامی لوگ زیادہ تر ماہانہ پاس رکھتے ہیں۔ مقامی لوگ سائیکل بخوبی استعمال کرتے ہیں اور اکثر ٹرین میں سائیکل ساتھ لے آتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، مرد و عورت سبھی سائیکل چلاتے ہیں اور ان کے لیے فٹ پاتھ پر الگ سے جگہ رہتی ہے۔

کھیل کود کے شائقین کا شہر:

ہمبرگ سیر و تفریح کے علاوہ کھیل کود کے شائقین کا بھی شہر ہے۔ سال کے تمام مہینے کسی نہ کسی نیشنل، یوروپین یا بین الاقوامی کھیل کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ تیراکی، تیراندازی، فٹ بال، ہاکی، ٹینس، بوٹ ریس وغیرہ یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ ثقافتی، معاشی، تکنیکی، فلمی اور موسیقی میلے بھی اکثر یہاں ہوتے رہتے ہیں۔ سال رواں میں فٹ بال ورلڈ کپ کے علاوہ ہاکی کا ورلڈ کپ بھی یہاں کھیلا گیا۔ ستمبر میں پانی کے بڑے جہاز کوئین میری کی دوبارہ آمد کا شدید انتظار تھا۔ اسی طرح 2006 میں ستمبر سے دسمبر تک ہمبرگ میں چینی کلچر، فلم، طعام و کرتب کے خاص میلے لگنے کے اشتہار جگہ جگہ نظر آئے۔ یہاں کھیل کود کے مظاہرے اور پریکٹس کے لیے 150 اسپورٹس کمپلیکس 585 ہال اور 21 سوئمنگ پولس۔ 18 ملین یورو (تقریباً 720 ملین روپے) کی لاگت سے ان اداروں کی مزید توسیع کا پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ کئی پانی کے کھیل یہاں مشہور ہیں اور واٹر پولو میں جرمن بے حد ماہر ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا گٹھیلا بدن، دراز قد، خوبصورت اور امنگ بھرا چہرا جرمن نسل کی شناخت ہے۔

فیشن ہاؤس اور بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورس:

ہمبرگ کے لوگ نہایت خوش پوشاک اور Elegants ہوتے ہیں۔ یہاں کئی مشہور بیوٹی پارلر کے علاوہ بڑے بڑے ہال بھی ہیں۔ نیویا ہاؤس سب سے جدید اور دلچسپ فیشن اور مساج کی جگہ ہے۔ کارسٹڈٹ یہاں کا سب سے پرانا اور بڑا اسٹور ہے جہاں 800 ملازم تقریباً ساٹھ ہزار خریداروں کی ہر دن خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ اوسطاً یہاں ستر لاکھ قسم کی اشیا فروخت کی جاتی ہیں جس سے اس صد سالہ اسٹور کی وسعت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں بڑے بڑے بازار اور ہوٹل شہر کی زینت بڑھاتے ہیں جن میں ہمبرگر ہاف، گیلریا اور السٹر ہاؤس بہت مشہور ہے۔ مشہور ہوائی جہاز کمپنی کا کارخانہ بھی ہمبرگ میں ہے۔ برلن کی طرح ہمبرگ میں بھی کئی مشہور عجائب گھر اور ایک بڑا چڑیا گھر ہے جو کافی معلوماتی ہے۔

الفالو بل آئس بار:

ہمبرگ کے دیگر دیدنی مقامات میں یہ برفیلا شراب خانہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ حالانکہ مجھے یہاں جانے کا موقع نہیں ملا مگر اس کی شہرت ضرور سنی۔ 12 یورو (تقریباً 700 روپے) کی داخلہ فیس میں ایک مشروب بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک بڑے ہال کے اندر جہاں 70 مہمان کے بیٹھنے کی گنجائش ہے برف کے کئی خوبصورت بت اور بناوٹیں اس کمرے کا درجۂ حرارت منفی 5oC بنائے رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہاں مشروب نوش کرنے کے لیے خاص گرم کوٹ اور اوورکوٹ کی ضرورت پڑتی ہے اور عین گرمی میں بھی گہری سرد اور برفانی ماحول رہتا ہے۔ دنیا کے مشہور آئس آرٹسٹوں نے اس بار کو بنانے اور سجانے میں اپنی صلاحیت صرف کی ہے۔ پوری جرمنی میں اس طرح کا یہ پہلا شراب خانہ ہے۔ چونکہ ہر چھ یا نو مہینے میں برف کے مجسمے پگھل جاتے ہیں لہٰذا مختلف مجسمہ سازوں کو اپنی کاریگری اجاگر کرنے کا موقع بار بار ہاتھ آئے گا۔ یہ بار سہ پہر سے نصف رات تک کھلا رہتا ہے۔

ہمبرگ میں دنیا بھر کے ہر طرز، ذائقے اور کلچر کے ریسٹورنٹ عام ہیں۔ پاکستانی اور ترکی مطعم میں خوش ذائقہ گوشت کے سالن ملتے ہیں۔ ہم نے اپنے قیام کے درمیان لنچ و ڈنر میں اکثر ترکی ریسٹورنٹ سے شاور ما یا ترکی پیزا کھایا جہاں 3 سے 5 یورو میں وافر مقدار میں کھانا مل جاتا تھا۔ یہاں کے چینی ریسٹورنٹ بھی بہت مشہور ہیں مگر نسبتاً مہنگے ہوتے ہیں۔ کئی جگہ صرف

لذیذ سوپ کے ریسٹورنٹ بھی ہیں۔ جن میں Soups & Friends کافی مشہور ہیں۔ ہندوستانی شکارا، شالیمار اور اشوکا ریسٹورنٹ بھی کافی مقبول ہیں جو عموماً روزانہ شام پانچ بجے سے نصف رات تک کھلے رہتے ہیں۔ بیکریوں میں طرح طرح کے کیک، چاکلیٹ، ڈبل روٹیاں، برگر و دیگر گوناگوں اقسام کے پکوان بڑے سلیقے سے سجائے ہوتے ہیں۔ ہمارے لحاظ سے چائے و کافی مہنگی یعنی ڈیڑھ سے ڈھائی یورو تک ملتی ہے۔ آئس کریم کی بھی درجنوں قسمیں سیاحوں کو لبھاتی رہتی ہیں۔ ترکی مطعم میں چکن گرل بھی کافی لذیذ اور دبیز ملتا ہے مگر اس کے ساتھ سلاد اور مشروب ملا کر لیں تو پھر قیمت بڑھ جاتی ہے۔ عام طور پر ہر جگہ Minu دستیاب ہوتے ہیں۔

ہمبرگ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہیں پھر بھی چھوٹی بڑی پانچ مساجد ہیں۔ جیسا کہ ہمبرگ میں 25 سالوں سے مقیم ایک پاکستانی مسلمان سے گفتگو سے پتہ چلا۔ یہاں کے لوگوں میں مسلمانوں کے تئیں بظاہر کوئی نفرت نہیں ہے۔ امریکہ کے 9/11 سانحہ کے بعد بھی یہاں کوئی خاص ردعمل مسلمانوں کے خلاف نہیں ہوا تھا۔ عام لوگ نہایت امن پسند ہیں۔ کبھی کبھی NeoNazi ضرور شورش کرتے ہیں۔ ہمبرگ میں زیادہ تر مساجد ترکی مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں۔ سنٹرل ریلوے اسٹیشن کے پاس بڑی جامع مسجد ہے جس سے متصل ایک اسلامک سنٹر اور مدرسہ بھی ہے۔ جرمن میں عیسائی اور مسلم رواداروں کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں تقریباً 21 سال قبل مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان بڑے پیمانے پر مذہبی مذاکرات ہوئے تھے اور کئی مقامی Christian-Islamic ادارے اس ضمن میں کام کر رہے ہیں۔ 2003 کے شروع میں اس طرح کا ایک بڑا مرکز کونسل آف مسلم عیسائی الحاق عمل میں آیا۔ جرمنی میں مجموعی طور پر 41 ملکوں کے 32 لاکھ مسلمان رہتے ہیں جن میں ترکیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر یوگوسلاویہ سے بے دخل مسلمانوں کی تعداد ہے۔ دیگر آبادی عرب اور جنوب مشرقی ایشیا سے یہاں آکر بسے مسلمانوں کی تعداد ہے۔ دیگر آبادی عرب اور جنوب مشرقی ایشیا سے یہاں آکر بسے مسلمانوں کی ہے۔ مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ ترکی اور الائنس گروپ کے ادارے بھی فعال ہیں۔

برلن:

برلن جرمنی کا دارالسلطنت اور مشہور تاریخی شہر ہے۔ قدیم و جدید زمانے میں اس شہر نے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ دونوں عظیم جنگوں میں اس شہر کے عروج و زوال کی کہانی بڑی لمبی اور دلسوز ہے۔ 55 ہزار یہودیوں کا قتل ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔ مگر آج کے ترقی پذیر اور خوبصورت برلن کو دیکھ کر ایسا کچھ نہیں لگتا کہ ماضی میں یہ شہر ایسے حادثوں سے گزرا ہے۔ آج کے برلن میں خوبصورت عمارتیں، لوگوں کا ہجوم، پرسکون پارک، وسیع دکانیں، بازار اور سیاحوں کی ہماہمی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ برلن میں وسیع عجائب خانے ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔ جرمنی میں چھ ہزار عجائب گھر ہیں۔ برلن یونیورسٹی کے میوزیم میں میرے استاد مرحوم ڈاکٹر سالم علی نے وہاں کے پروفیسر اروِن اسٹریسی مین کے زیر قیادت 1935 میں پرندوں کی Taxonomy پر ریسرچ کیا تھا۔ لہٰذا مجھے اس میوزیم کو دیکھنے کی بہت خواہش تھی مگر پرندوں کی رواں کانفرنس میں شرکت کی وجہ سے وہاں کا تقریباً سارا عملہ ہمبرگ میں تھا۔ لہٰذا عمارت اور اس کے کچھ حصوں کے علاوہ میں پرندوں کے سیکشن کو جی بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ مشہور برلن دیوار کے کچھ حصے اور مرکزی گیٹ اب بھی بچے ہوئے ہیں جو مغربی اور مشرقی جرمنی کو 1995 تک منقسم کیے ہوئی تھی۔ لوہے کے گارڈر اور سیمنٹ و پتھر کی یہ مضبوط اور 45 کلومیٹر لمبی دیوار اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ چونکہ میرے پاس برلن میں صرف 8 گھنٹے کا وقفہ تھا میں نے Citytour Bus کا 13 یورو میں ٹکٹ لے کر شہر کے بیشتر حصے کی جھلک دیکھی۔ بس میں ٹورسٹ گائیڈ نہایت روانی سے جرمن اور انگریزی میں باری باری قابل دید مقامات کی نشاندہی کرتا گیا۔ بس دومنزلہ تھی اور میں نے اوپر کی سیٹ لے رکھی تھی اس لیے عمارتوں اور گرجا گھروں، محل اور ہرے بھرے خوبصورت پارک، کشادہ سڑکیں اور بازار کا نظارہ بخوبی ہو رہا تھا۔ خاص جگہوں پر بس رک جاتی تو ہم جلدی سے تصویریں لے لیتے۔

دو گھنٹے کے اس معلوماتی سفر میں ہم نے 57 منتخب جگہوں کی جھلک دیکھ لی اور ایک راستے میں ہندوستانی سفارت خانہ بھی نظر آیا جہاں اور کئی ملکوں کے سفارت خانے بھی تھے۔ برلن میں مشہور سنٹرل جگہ زوسٹرڈ کا چوراہا ہے جہاں سے سیاحی بسیں ملتی ہیں۔ پورے شہر میں زمین دوز ٹرین کا جال بچھا ہوا ہے اور مقامی بسیں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ وسط شہر میں پرائیویٹ کار بہت کم دکھائی دی جس کی وجہ سے ٹریفک کی رفتار بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ یہاں کی مشہور جگہوں میں امریکن چارلی گیٹ، جو جنگ عظیم دوئم کے درمیان بہت مشہور تھا، اب بھی سیاحوں کو متوجہ کرتا ہے۔ اسی طرح برلن دیوار کے مرکزی گیٹ کے اطراف میں سیاحوں کا میلہ سا رہتا ہے۔ یہاں پر انسانی سفید پتلے نت نئے انداز میں زائرین کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ ہماری سٹی ٹیور بس یہاں پر 15 منٹ کے لیے رکی تھی۔ ریچسٹیگ بلڈنگ برلن کی ایک قدیم شاندار عمارت ہے جس کے اوپری حصے کی جدید توسیع کی گئی ہے اور اب یہ شیشے کے غلاف اور خوبصورت سیڑھیوں پر مبنی عمارت ہزاروں سیاحوں کا پسندیدہ مرکز ہے۔

ایک جگہ ہمیں جرمن قیصر کا محل بھی دکھایا گیا جو ایک نہایت عالی شان

عمارت تھی اور اب اس میں جرمنی کے وزیر اعظم (چانسلر) رہتے ہیں۔ اتنی اہم عمارت کی حفاظت کے لیے صرف دو سپاہی گیٹ پر نظر آئے اور ہماری بس عمارت کے اتنے قریب سے گزری کہ ہم اس کی تصویر کئی زاویہ سے لے سکے۔ اس عمارت کے نزدیک ہی خوبصورت حکومتی کارکنوں کے کمپلکس ہیں جنھیں گورنمنٹ بلڈنگس کہتے ہیں۔ وہاں سے نزدیک ہی جرمنی کا خوبصورت سینٹرل ریلوے اسٹیشن ہے جو گذشتہ سال ہی تیار ہوا ہے۔ شیشے سے ڈھکی یہ عظیم عمارت اپنی مثال آپ اور جرمن کاریگری کا ایک شاہکار ہے۔ اسی اطراف میں اسپری دریا کے کنارے ایک بے حد خوبصورت اور سبزہ زار پارک ہے۔ وسط شہر میں یہودیوں کا بہت بڑا قبرستان بھی ہے جہاں ہٹلر نے 35 ہزار یہودیوں کو مار ڈالا تھا اور جس کا تاوان ہر جرمن اب تک چکا رہا ہے۔ سیاحتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ جگہ عبرتناک اور سبق آموز بھی ہے کہ دنیا میں قوم وفرد کا عروج اور تخت وتاج کا نشہ انسانی قدروں کو کس حد تک پامال کر سکتا ہے۔

برلن میں تعلیمی اداروں کی بھی کثرت ہے۔ دو سو پچاس اعلیٰ درجے کے تحقیقاتی اداروں کے علاوہ تین یونیورسٹیاں، چار آرٹس کالج، نو اعلیٰ درجے کے تعلیمی انسٹی ٹیوٹ، مشہور یوروپین اسکول آف مینجمنٹ اور کئی میڈیا سینٹر کے جدید اسکول ہیں۔ برلن میں یوروپ کا سب سے بڑا اشاعتی مرکز بھی ہے۔ دس روزانہ اخبار کے علاوہ 23 ماہانہ میگزین چھپتے ہیں۔ برلن میں 25 علاقائی ریڈیو اسٹیشن اور ایک بہت بڑا ٹی.وی. ٹاور ہے۔ بڑے بڑے تھیٹر ہال، اوپرا ہاؤس اور لائبریری یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی تہذیب کا گہوارہ ہیں۔ برلن جرمنی کا دارالسلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ یوروپ میں بزنس، انڈسٹری اور دیگر کاروبار کا مرکز بھی ہے۔ وسط شہر میں یوروپ کا سب سے بڑا Departmental Store ہے جس کی پانچ منزلہ وسیع عمارت میں یومیہ لاکھوں یورو کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور مشہور ہے کہ یہاں برطانوی شہزادی پرنس ڈائنا اور پرنس چارلس نے متعدد بار خریداری کی تھی۔ اس طرح برلن قدیم وجدید تمدن کا ایک سنگم نظر آتا ہے اور یہاں کی سیر ایک بے حد یادگار اور دلچسپ ومعلوماتی تجربہ ہے۔ مگر برلن کی سیر کا بھرپور مزہ لینے کے لیے کم ازکم ایک ہفتے کا قیام ناگزیر ہے۔ ہمبرگ کی طرح برلن میں بھی ریسٹورنٹس اور بڑے ہوٹلوں کی بھرمار ہے۔ ہم نے کھانا ایک ترکی ہوٹل میں کھایا اور رات کے کھانے کے لیے کنٹکی فرائیڈ چکن کے مزیدار مینو سے کچھ سامان ساتھ لے لیا جو ہمبرگ واپسی پر بس میں تناول کیا۔

ہمبرگ اور برلن کے علاوہ جرمنی میں اور بھی کئی بڑے شہر ہیں جن میں فرینکفرٹ، میونخ، بون، برمن برگ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ برمن کے بندرگاہ پر سالانہ دس ہزار بحری جہاز دنیا کے تقریباً ہزار بندرگاہوں سے رسد لاتے اور لے جاتے ہیں۔ ہائیڈل برگ بھی ایک بڑا شہر ہے جہاں کی قدیم یونیورسٹی سے علامہ اقبالؒ نے .Ph.D کیا تھا۔ چونکہ میرا موجودہ سفر آرتھولوجیکل کانگریس میں شمولیت کی غرض سے تھا یہی وجہ ہے کہ میں جرمنی کی سیر حاصل سیاحی نہیں کر سکا۔ اگر موقع ملا تو اس خوبصورت اور دلچسپ ملک کا دورش پھر کروں گا۔ اس ملک کی موجودہ ترقی دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسٹالن کی انتقامی تباہی وبربادی کے باوجود 65 سال کے قلیل عرصہ میں یہ ملک اتنا ترقی یافتہ ہو گیا ہے جو یہاں کے لوگوں کی انتھک محنت، دیانت داری، تنظیم اور سیاسی و اقتصادی شعور کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

ہمبرگ سے برلن کی دوری تین سو کلومیٹر ہے جو ہماری بس نے تین گھنٹے میں طے کیا۔ یہ ایک دو منزلہ مکمل AC آرامدہ بس تھی جس کا آنے جانے کا کرایہ مناسب یعنی 39 یورو (تقریباً ڈھائی ہزار روپئے) تھا۔ اگر واپسی رات 9 بجے کی بس سے کرتا تو 30 ہی یورو کا صرفہ تھا مگر میں دیر رات لوٹنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ کانگریس کی کاروائی اگلی صبح 8.30 سے شروع ہونی تھی۔ ہمبرگ سے بس صبح سات بجے روانہ ہوئی تھی اور برلن 10 بجے پہنچی وہاں سے واپسی 8 بجے شام کی بس سے ہوئی جو بلا کسی تاخیر کے ٹھیک 10 بجے ہمبرگ پہنچ گئی۔ میں نے اوپری منزل میں جگہ لے رکھی تھی اس طرح جرمنی کے کھیت کھلیانوں کی بھی سیر ہوگئی۔ بڑے بڑے کھیتوں میں ہوائی مشین کے ٹربائن کے ذریعہ سیرابی کی جاتی ہے جو بجلی فراہمی کا سستا ذریعہ ہے اور اس سے ماحولیاتی کثافت بھی نہیں ہوتی۔

دس دنوں کے یادگار سفر کے بعد ہمبرگ سے ہماری واپسی ویانا ہوتے ہوئے 20 اگست کو ہوئی۔ دیر رات جب ہم دہلی کے اندرا گاندھی ایرپورٹ پر پہنچے تو ہمارا جہاز کافی دیر کے لیے فضا کے چکر لگاتا رہا، شاید سبھی رن وے مصروف تھے۔ زمین پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہمیں باور کرا رہی تھی کہ اب ہم اپنے ملک واپس آ گئے ہیں کیونکہ اس وقت یوروپ وامریکہ کا کوئی بھی شہر روشنی کی چکاچوند میں نہایا ہوتا ہے۔

اس سفر میں مالی تعاون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور نیشنل سائنس اکیڈمی، نئی دہلی نے کی اور ہمبرگ میں رہائش کانفرنس کے منتظمین نے فراہم کی۔ میرے میزبان مسٹر اور مسز روتھ موس نہایت خلیق انسان تھے۔ اس ضعیف جوڑے نے اپنے خوبصورت مکان کا بالائی کمرہ ان مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس طرز کی میٹنگ یا کانفرنس میں ہمبرگ آتے ہیں۔ بغیر کسی بدلے یا شہرت یا معاوضہ کے ایسا جذبہ دنیا کے بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں طعام کے قبل اور بعد میں باضابطہ دعا ہوتی ہے جو اسلامی

معاشرے کا بھی ایک خاص جز تھا مگر ہم میں سے بیشتر تو اب بسم اللہ اور الحمدللہ بھی نہیں کہتے۔ مسز روتھ مہمانوں کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اپنے قیام کے علاوہ ان کے گیسٹ روم میں رکھی Visitors Book سے ہوا جس میں مہمانوں نے اپنا تاثر لکھا تھا اور تقریباً سبھی کی تصویر بھی اس صفحہ پر نہایت قرینے سے چپکائی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اپنا مختصر تاثر بشکریہ میزبان لکھ دیا۔ علی گڑھ واپسی کے بعد مسز روتھ کی بھیجی ہوئی ہماری کئی تصویریں ای میل سے ملیں اور قرین قیاس ہے کہ ان میں سے کوئی تصویر ان کی Visitor's Book میں بھی چسپاں کی گئی ہوگی۔ سفر کی آخری رات مسز روتھ نے گفتگو کے درمیان مجھ سے کہا کہ آپ نے تو میرے گھر میں قیام اس خاموشی سے کیا کہ ایسا لگا ہی نہیں کہ اوپر کے کمرے میں کوئی رہتا ہو۔ برائے مہربانی کم از کم آج صبح ہمارا تولیہ ضرور استعمال کریں اور اپنے ساتھ سفر میں اپنا گیلا تولیہ نہیں لے جائیں۔ میں ان کے اخلاق کا مزید قائل ہو گیا۔ واپسی کی صبح مجھے وہ الوداع کرنے لوکل اسٹیشن تک آئیں اور بڑی شفقت اور محبت سے دوبارہ ہمبرگ آنے اور اپنے گھر پر قیام کی پرزور دعوت دی۔ ہمبرگ کی خوبصورتی، سبزہ زار اور ہماہمی نے مجھے پہلے سے ہی بہت متاثر کیا تھا۔ پتہ نہیں مسز روتھ کی دعوت کب مہمیز کا کام کر جائے اور میں جرمنی کے ایک اور سفر کے لیے پابہ رکاب ہو جاؤں۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

□□□

پتہ:
Deptt. of Wild Life Sciences
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P.)

دھوپ چولھا

مصنف: ایم۔ایم۔ ہدیٰ/مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔ دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات:100، قیمت-/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات، انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ ''کیمیا کی کہانی'' میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات:128، قیمت:-/16 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد و توہمات سے واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت:-/23 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات:148، قیمت-/18 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 066

الیاس انور

کیریئر

ہندوستانی بحریہ

ہندوستانی بحریہ کی ابتدا سترھویں صدی کی شروعات سے ہوئی تھی۔ اس وقت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے ایک جنگی دستے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ہندوستانی بحریہ کی بنیادی ذمہ داری ملک کے لگ بھگ چھ ہزار کلومیٹر لمبے سمندری ساحل و بحر عرب اور بنگال کی کھاڑی کے جزائر کی حدود کی حفاظت کرنا ہے۔

موجودہ دور میں ہتھیاروں کی دوڑ اور زمانہ حال کے نئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری نیوی نے نہ صرف سمندری سطح پر بلکہ اپنے ہوائی جہازوں، آبدوزوں و دیگر جہازوں کی وجہ سے ہوا اور پانی کے نیچے بھی نقل و حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے۔ نیوی میں بھی دو سطح یعنی افسری کیڈر اور دوسرا نان کمیشن آفیسر (NCO) کی بھرتیاں کی جاتی ہیں۔

بحریہ میں افسروں کے کیڈر کی چھ شاخیں ہیں — ایگزیکیٹو، انجینئرنگ الیکٹریکل، سپلائی و سکریٹریٹ، ایجوکیشن اور میڈیکل۔ ان تمام افسران کی ذمہ داریاں بھی ان کی اپنی اپنی شاخوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ ایگزیکیٹیو برانچ کے افسران کی ذمے داری جہازوں ہتھیاروں کے استعمال کی اہلیت و استعداد، جہازوں، ناؤں اور جہاز رانی کے بارے میں مکمل جانکاری، انجینئرنگ شاخ کے افسران جہاز کی مشینری کی دیکھ بھال اور ان کے نقل و حمل کو قائم رکھتے ہیں۔ الیکٹریکل شاخ کے افسران کا کام جہاز کی بجلی سے متعلق کاموں اور ساز و سامان کی دیکھ بھال ہے۔ تنخواہ، حساب کتاب، اسٹور اور دیگر دفتری کاموں کی دیکھ بھال کرنے کی ذمے داری سپلائی اور سکریٹریٹ برانچ کے افسروں پر عائد ہوتی ہے۔ تعلیمی شاخ کے افسران کی ذمہ داری ہے سپاہیوں کو ابتدائی سے لے کر پوسٹ گریجویٹ سطح تک تعلیم دینا نیز غیر ملکی زبانوں اور نقشوں کے مطالعے کے مختلف کورسز چلانا۔

بحریہ میں مستقل کمیشن یا افسری عہدے کے لیے نوجوان مختلف اسکیموں کے تحت داخل ہو سکتے ہیں۔

(الف) کیڈٹ انٹری بذریعہ نیشنل ڈیفنس اکادمی

(ب) کیڈٹ انٹری نیول (نے+ول) اکادمی گوا، بذریعہ نیشنل ڈیفنس اکادمی

دونوں کے لیے تعلیمی قابلیت 10+2 مع علم طبعیات اور ریاضی ہے۔

نیوی میں بھرتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ امیدوار اپنے درخواست فارم میں پہلے اور دوسرے نمبر پر بحریہ (نیوی) کو ترجیح دیں۔

نیوی کی ایگزیکیوٹیو شاخ میں انتخاب کے بعد کیڈٹ کو نیول اکادمی گوا تین سال کی تربیت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ نیول اکادمی گوا اور این ڈی اے میں نیوی کے کیڈٹ کی یکساں تربیت ہوتی ہے۔ تربیت کے بعد دونوں جگہوں کے کیڈٹ کو مزید تربیت کے لیے کسی تربیتی جہاز پر بھیجا جاتا ہے۔ اس تربیت کے مکمل کرنے کے بعد کیڈٹ کو ترقی دے کر چھ ماہ کی مڈشپ مین کی تربیت کے لیے سمندری جہاز پر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس تربیت کو کامیابی سے پورا کرنے کے بعد ان جوانوں کو کمیشن سے عہدہ دیا جاتا ہے۔

(ج) مخصوص بھرتی برائے نیول اکادمی گوا، اس بھرتی کے لیے کم از کم عمر 19-22 کے درمیان ہونی چاہیے۔ تعلیمی قابلیت بی۔ایس سی مع علم طبعیات اور ریاضی یا انجینئرنگ کی ڈگری ہونا لازمی ہے۔ کمیشن عہدے کی بھرتی یو پی ایس سی کے ایک مشترکہ امتحان کے ذریعے کی جاتی ہے۔

تحریری امتحان کے کامیاب امیدواروں کو سروس سلیکشن بورڈ کے انٹرویو اور ڈاکٹری معائنہ کے تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعد ازاں نیول اکادمی گوا تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

(د) این سی سی نیوی میں اس مخصوص داخلے کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت بی ایس سی مع علم طبعیات و ریاضی یا بی ای کے ساتھ ساتھ این سی سی کے سینئر ڈویژن کے نیول ونگ کا سرٹیفکیٹ ہونا لازمی ہے۔ عمر 22-19 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ امیدواروں کا براہ راست انتخاب ایس ایس بی کے انٹرویو اور ڈاکٹری معائنے میں کامیاب ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

(ہ) براہ راست بھرتی نیول آرمامینٹ انسپکشن کیڈر۔ اس کیڈر میں بھرتی کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت الیکٹرانکس، الیکٹریکل یا میکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری یا الیکٹرانکس یا فزکس میں پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری ہونا لازمی ہے۔ عمر 19-25 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ امیدوار کا غیر شادی شدہ ہونا بھی ضروری ہے۔ درخواست کی بنیاد پر چنے ہوئے امیدواروں کو ایس ایس بی کے انٹرویو، ٹیسٹ اور ڈاکٹری معائنے کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں کامیاب ہونے کے بعد ہی انتخاب ہوتا ہے۔

(و) قانون کیڈر میں بھرتی کے لیے تعلیمی قابلیت قانون کی ڈگری مع 55 فیصد نمبروں کے یا اس سے زیادہ۔ عمر 22-27 سال کے درمیان نیز ایڈووکیٹ ایکٹ 1961 کے تحت ایڈووکیٹ کی فہرست میں نام درج ہو۔

نیوی کے ہیڈ کوارٹرس کی سفارش پر بھیجے ہوئے امیدواروں کے نیول سلیکشن بورڈ کے سامنے انٹرویو وغیرہ کے لیے پیش ہونا لازمی ہے۔ امیدواروں کو لیڈر شپ کے اوصاف اور جسمانی موزونیت کے امتحان سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ چنے ہوئے امیدواروں کی شروع کی تربیت گوا کی نیوی اکادمی میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد امیدواروں کو مزید تربیت کے لیے نیوی سے متعلق مختلف اداروں میں بھیجا جاتا ہے۔ تربیت کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد امیدواروں کو قانونی کیڈر میں مستقل کمیشن عطا کیا جاتا ہے۔

انجینئرنگ کیڈر میں بھرتیاں:

اس شاخ میں بھرتی کے لیے کئی طریقے ہیں:

(الف) کیڈٹ انٹری بذریعہ این ڈی اے

(ب) کیڈٹ انٹری اسکیم (انجینئرنگ) تعلیمی قابلیت 2+10 مع علم طبعیات، علم کیمیا اور ریاضی اور 70 فیصد یا اس سے زیادہ نمبروں کا اوسط 2+10 کے امتحان میں حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں بھی 50 فیصد نمبر دسویں یا بارویں کے امتحان میں ہونے لازمی ہیں۔ امتحان یو پی ایس سی کے ذریعے لیا جاتا ہے۔

(ج) براہ راست بھرتی مستقل اور کم مدتی کیڈروں کے لیے ہوتی ہے۔ اس بھرتی کے لیے عمر 25-19 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ تعلیمی قابلیت میرین، میکینکل، ایرونائیکل کنٹرول، میٹالرجیکل، پروڈکشن، انجینئرنگ میں کسی ایک میں ڈگری۔ براہ راست بھرتی کے لیے نیول ہیڈکوارٹرس کی طرف سے درخواستیں منگائی جاتی ہیں، تعلیمی قابلیت نمبروں اور دیگر خصوصیات کی بنا پر منتخب امیدواروں کو انٹرویو اور ڈاکٹری معائنے کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

(د) یونیورسٹی انٹری اسکیم بھی مستقل اور کم مدتی کیڈروں کے لیے کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بھرتی کے لیے قابلیت وہی ہے جو براہ راست انٹری اسکیم کے لیے لازمی ہے۔ ان طلبہ کے لیے جو ڈگری کورس کے آخری سال میں ہیں عمر 24-19 سال اور جو کورس کے تیسرے سال میں ہیں ان کے لیے عمر 23-18.5 سال ہے۔

اس بھرتی کے لیے نیوی کی ایک ٹیم ملک کے مختلف انجینئرنگ کالجوں کا دورہ کرتی ہے اور وہیں مناسب امیدواروں کا انتخاب کرتی ہے۔ بھرتی کے فارم وغیرہ بھی یہی ٹیم کالجوں میں مہیا کراتی ہے۔ انتخاب کے بعد امیدواروں کو بحریہ کے مختلف جہازوں پر تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد ہی انھیں کمیشن عطا کیا جاتا ہے۔

انجینئرنگ شاخ (نیول نقشہ نویس یا آرکی ٹیکچر:

(الف) 2+10 ٹیکنیکل کیڈٹ انٹری (نیول آرکی ٹیکچر)

تعلیمی قابلیت 2+10 علم طبعیات، علم کیمیا اور ریاضی کے ساتھ 70 فیصد نمبرات یا اس سے زیادہ حاصل کیے ہوں۔ ساتھ ہی انگریزی میں بھی 50 فیصد نمبرات دسویں یا بارہویں کلاس کی سطح پر حاصل کیے ہوں۔ عمر 19-16.5 سال کے درمیان۔

(ب) براہ راست بھرتی:

بحریہ کی اس شاخ میں مستقل بھرتی کے لیے نیول آرکی ٹیکچر، میکینکل، ایرونائیکل سول، میٹلرجیکل میں سے کسی ایک میں ڈگری مع 60 فیصد نمبروں کے ساتھ عمر 25-21 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔

الیکٹریکل:

بحریہ کی اس شاخ میں بھرتی کے حسب ذیل طریقے ہیں:

(الف) کیڈٹ انٹری (این ڈی اے):

(ب) 2+10 (ٹیکنیکل) کیڈٹ انٹری اسکیم

(ج) براہ راست بھرتی کے تحت مستقل و کم مدتی کمیشن عطا کیا جاتا ہے۔ اس اسکیم میں بھرتی کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت الیکٹریکل، الیکٹرونکس، ٹیلی کمیونی کیشن میں سے کسی ایک میں انجینئرنگ کی ڈگری۔ عمر 25-19.5 سال کے درمیان۔

(د) یونیورسٹی انٹری اسکیم کے تحت بھی مستقل و کم مدتی کمیشن عطا کیا جاتا ہے۔

تعلیمی (ایجوکیشن) کیڈر:

اس کیڈر میں براہ راست بھرتی مستقل کمیشن کے لیے کی جاتی ہے۔ اس کیڈر کے لیے تعلیمی قابلیت میکینیکل، الیکٹریکل، کمپیوٹر سائنس میں سے کسی ایک میں انجینئرنگ کی ڈگری یا ایم ایس سی کی سطح پر علم طبعیات اور بی ایس سی کی سطح پر ریاضی یا ایم ایس سی کمپیوٹر سائنس یا کمپیوٹر ایپلیکیشن اور بی ایس سی کی سطح پر علم طبعیات یا ریاضی — عمر 25-21 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

براہ راست بھرتی کے تحت آنے والی تمام شاخوں کی بھرتیاں کم مدتی ہیں اور اس میں خواتین اور مرد دونوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔

(اس کیڈر کا تعلق فوجی نقل و حمل اور قیام و رسد سے ہے۔ یہاں بھی کم مدتی کمیشن عطا کیا جاتا ہے۔ اس کیڈر میں بھرتی کے لیے عمر 25-19.5 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ تعلیمی قابلیت بی اے (معاشیات) یا بی کام یا بی ایس سی (علم طبعیات اور ریاضی) سبھی میں کم از کم سیکنڈ ڈویژن یا بی ای یا بی ٹیک یا گریجویشن کے ساتھ میٹیریل (Material) یا فائنانشیل منیجمنٹ میں ڈگری یا ڈپلوما حاصل کرنا ضروری ہے۔)

(ج) براہ راست بھرتی برائے ایجوکیشن کیڈر:

اوپر کے تینوں کیڈروں میں بھرتی کے لیے خواتین اور مردوں کے لیے جسمانی معیار الگ الگ ہے۔

بحریہ کی چند شاخوں میں مستقل یا کم مدتی کمیشن کی براہ راست بھرتی کے

لیے کسی قسم کا تحریری امتحان نہیں ہوتا ہے بلکہ ایس ایس بی یا بحریہ سلیکشن بورڈ کی جانب سے منتخب درخواست دہندگان کو نفسیاتی ٹیسٹ، انٹرویو اور ڈاکٹری معائنہ جیسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

سیلرز کی بھرتی:

بحریہ میں جہاز رانی (سیلرز) زونل بھرتی دفتروں اور نیول ریکروٹمنٹ اسٹبلشمنٹ کے ذریعے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ یہ بھرتی کے دفاتر ملک بھر میں پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ کبھی کبھی بھرتی کرنے والے افسروں کی ٹیم ملک کے مختلف حصوں میں دورہ کرتی ہے اور سیلرز کی بھرتی کرتی ہے۔ افسروں کے اس دورے کی اطلاع کافی پہلے ملک کے سرکردہ اخباروں کے ذریعے دے دی جاتی ہے تاکہ وہ نوجوان جو ہندوستان بحریہ میں بھرتی ہونا چاہتے ہیں اس ٹیم سے رابطہ قائم کرسکیں۔

سیلرز بھرتی کے بعد انھیں دو حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ پہلا آرٹی فائزر اور دوسرا نان آرٹی فائزر آرٹی فائزر ایک بہت ماہر ٹیکنیشن ہوتا ہے اور اس کی ذمے داریاں بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ اس کا کام الیکٹریکل، انجینئرنگ، شپ رائٹ کیمونی کیشن وغیرہ سے متعلق ہوتا ہے۔ نان آرٹی فائزر مختلف شاخوں جیسے اسٹیورڈس کُکس، موسیقی کار وغیرہ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔

(الف) آرٹی فائزر اپرینٹس ان آرٹی فائزر اپرینٹس کی ضرورت الیکٹریکل و انجینئرنگ اور شپ رائٹ کی شاخوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس بھرتی کے لیے تعلیمی قابلیت میٹرک یا سیکنڈری پاس مع سائنس اور ریاضی امتحان میں کم از کم 60 فیصد نمبر حاصل کیے ہوں۔ ایسے امیدوار جنھوں نے میٹرک میں 60 فیصد سے کم نمبر حاصل کیے ہوں لیکن اس کے بعد بورڈ کا امتحان 55 فیصد نمبروں سے پاس کیا ہو وہ بھی اس بھرتی کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ آرٹی فائزر کی بھرتی کے لیے عمر 18-15 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ اس بھرتی کے لیے غیر شادی شدہ ہونا بھی لازمی ہے۔ اس بھرتی کے لیے قطعی انتخاب تحریری امتحان، ڈاکٹری معائنہ اور انٹرویو کے بعد ہوتا ہے۔ امیدواروں کو مع درخواست فارم کے نزدیک کے بھرتی دفتروں سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ بھرتی کے دفتروں میں امیدواروں کی تعلیمی قابلیت، کھیل کود، این سی سی اور ابتدائی ڈاکٹری معائنہ کی بنیاد پر چھانٹا جاتا ہے۔ ابتدائی ڈاکٹری معائنہ ایک طے شدہ معیار کے مطابق کیا جاتا ہے۔

ابتدائی ڈاکٹری معائنہ اور دیگر مراحل سے گزرنے کے بعد کامیاب امیدواروں کو طے شدہ بھرتی کے دفتروں میں تحریری امتحان کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یہاں ان کا انگریزی، سائنس اور ریاضی کے مضامین میں تحریری امتحان لیا جاتا ہے۔ امتحان میں کامیاب امیدواروں کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اس فہرست کے مطابق 250-200 امیدواروں کو ڈاکٹری معائنہ اور انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔

مستقل انتخاب کے بعد امیدواروں کو ہندوستانی بحریہ کے کسی بھی تربیتی ادارے میں 3.5 سال کی تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اس تربیت کے بعد انھیں مزید چھ ماہ کے لیے بحریہ کے کسی بھی جہاز پر تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد امیدواروں کی تعلیمی قابلیت الیکٹریکل، میکینیکل، ایروناٹیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کے مساوی ہوتی ہے۔ کامیابی سے تربیت مکمل کرنے کے بعد امیدواروں کی آرٹی فائزر کلاس IV کے عہدے پر ترقی کی جاتی ہے۔ ایسے سیلرز جو لگن اور ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ جن کی کارکردگی اچھی ہوتی ہے اور جنھوں نے ہائر ایجوکیشن ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کی ہے ان کے لیے بحریہ کی مختلف شاخوں میں کمیشن عہدے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(ب) براہ راست بھرتی کے تحت سی مین کیمونی کیشن، الیکٹریکل، میڈیکل، انجینئرنگ، رائٹر، اسٹور اسسٹنٹس، نیویل ایویشن کے لیے بھرتی کی جاتی ہے۔ ان بھرتیوں کے لیے عمر 20-17 سال کے درمیان ہونی چاہیے۔ تعلیمی قابلیت—— میٹرک میں جو امیدوار 55 فیصد نہیں حاصل کر پائے ہیں ان کے لیے بورڈ کے امتحان میں 55 فیصد حاصل کرنا لازمی ہے۔ چھٹنی کے بعد چنے ہوئے امیدواروں کو طے شدہ بھرتی کے دفتروں میں انگریزی، عام معلومات کے تحریری امتحان کے لیے بلایا جاتا ہے۔ تحریری امتحان میں کامیاب امیدواروں کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ ان منتخب امیدواروں کو تفصیلی ڈاکٹری معائنے اور انٹرویو کے مراحل سے گزرنے کے بعد مستقل انتخاب ہوتا ہے۔ منتخب امیدواروں کو نیوی کے مختلف اداروں میں تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

(ج) براہ راست بھرتی: (غیر معمولی کھلاڑی) اس اسکیم کے تحت بھرتی کے خواہش مند غیر معمولی کھلاڑیوں نیول اسپورٹس کنٹرول بورڈ سیل ممبئی سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ایسے امیدواروں کو تحریری امتحان اور ڈاکٹری معائنے کے علاوہ نیول اسپورٹس کنٹرول بورڈ کی طرف سے منعقدہ کھیل کود کا آزمائشی امتحان بھی پاس کرنا ہوتا ہے۔ تحریری امتحان، ڈاکٹری معائنہ انٹرویو اور کھیل کود کے امتحان میں کامیابی کے بعد مستحق فہرست میں شامل امیدواروں کا ہی انتخاب ہوتا ہے۔ نیوی میں سبھی سیلرز کو تنخواہ اور دیگر الاؤنس کے علاوہ مفت کھانا، یونیفارم، رہائش، ڈاکٹری علاج مع اہل خانہ، کینٹین، مکان اور اسکوٹر کے لیے قرض، سفرخرچ جیسی مراعات دی جاتی ہیں۔

□□□

Chabki, P.O. Laxmi Sagar
Distt. Darbhanga - 846009
(Bihar)

تحریر: سید محمد محسن
ترجمہ: محمد رضوان احمد خاں

(ہماری مطبوعات سے)

ذہانت اور رجحان

ایک شخص کو ہم ذہین اور دوسرے کو کند ذہن کہتے ہیں پہلے شخص سے ہمیں مشکل کاموں کو سیکھ لینے اور جلد سیکھ لینے کی توقع ہوتی ہے۔ دوسرے شخص سے ہم صرف آسان کاموں کو سیکھنے اور انھیں آہستہ آہستہ سیکھنے کی توقع رکھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ پہلا شخص نئی اور غیر مانوس حالتوں سے مطابقت پیدا کرے گا۔ دوسرے شخص کو ایسے حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں دشواری ہوگی۔ پہلا شخص کسی نئے مسئلے کا حل تلاش کر لینے کا اہل ہوگا۔ دوسرا شخص ویسے ہی حل سے کام لینے کی کوشش کرے گا جنھیں اس نے قبل سیکھا ہے لیکن اب وہ اس نئی صورت حال کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ وہ نئے اور پرانے کے درمیان فرق کا صحیح اندازہ اسی وقت کر سکتا ہے جب دونوں بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ ایک ذہین آدمی کو بہت ہی لطیف اور باریک فرق کا بھی ادراک ہو سکتا ہے۔ وہ کسی چیز کی خصوصیتوں کا تصور اس چیز کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ وہ ایک وصف پر دوسرے اوصاف سے اسے علاحدہ کر کے غور کر سکتا ہے۔ وہ تجریدی طور پر سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر ایک ذہین شخص کو کسی نئی صورت حال میں عمل پیرا ہونے کو کہا جائے تو وہ اس صورت حال کے جو مختلف پہلو اور اجزا ہیں ان کے باہمی تعلق کو اخذ کرنے میں کامیاب ہوگا۔ صورت حال کے وہ پہلو اور عناصر جو مقصد کے حصول میں اس کی رہنمائی کر سکتے ہوں گے ان کی اہمیت کا وہ صحیح اندازہ کر سکے گا اور ان کے درمیان نئے رشتوں کا اور ان سے جو نتیجے اخذ کیے جاتے ہیں ان کا قیاس کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ کسی عمل کی انجام دہی سے پہلے اس کے نتیجے کی پیش بینی کرے گا۔ جیسے جیسے وہ کسی کام کو کرتے ہوئے آگے بڑھے گا۔ اپنے پچھلے اقدامات پر بھی اس کی نظر رہے گی اور یہ دیکھ سکے گا کہ جو قدم وہ اٹھا چکا ہے اس کا اس قدم کے ساتھ جو وہ اٹھانے جا رہا ہے کیا رشتہ ہے۔

ایک ذہین شخص مشکل اور پیچیدہ کاموں کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے۔ ایسے کام جنھیں بغیر زیادہ تبدیلی کے بار بار کرنا ہوتا ہے۔ ایک ذہین شخص کے اندر جلد اکتاہٹ اور تھکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ ذہانت ان تمام کاموں کا نام ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارے کام ذہانت کی نشانیاں ہیں ذہانت ان ساری کارکردگیوں اور ایسے ہی دوسرے کام کی پشت پر ہوتی ہے۔ ذہانت ہی کی وجہ سے کوئی شخص ان کاموں کو انجام دینے کا اہل ہوتا ہے۔ اس لیے ذہانت کو اس عام اہلیت کے طور پر سمجھنا چاہیے جو کسی شخص میں کم یا زیادہ مقدار میں موجود ہوتی ہے۔

ذہانت ایک عام اہلیت ہے کیونکہ اس کا اظہار ان مختلف اعمال کے ذریعہ ہوتا ہے جنھیں ایک ذہین شخص انجام دینے کا اہل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ذہانت کا اظہار کسی نئی بات کو سیکھنے، نئے حالات سے مطابقت حاصل کرنے، اشیا اور حالات کے درمیان رشتوں کو سمجھنے اور ان کا تصور کرنے، مسئلوں کو حل کرنے، لطیف موازنہ کرنے، تجریدی طور پر سوچنے، مشکل اور پیچیدہ کاموں کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے میں ہوتا ہے۔ مختلف ماہرین نفسیات نے ذہین کردار کے مختلف پہلوؤں کا انتخاب کرلیا ہے اور اسی کے مطابق انھوں نے ذہانت کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ذہانت کی ایسی ہی تعریفیں ملتی ہیں مثلاً "سیکھنے یا نئی صلاحیتوں کو حاصل کرنے کی صلاحیت" "نئے حالات میں مطابقت کی صلاحیت" "تجریدی فکر کرنے کی صلاحیت" "رشتوں کا درک کرنے کی صلاحیت" وغیرہ وغیرہ۔ بعض ماہرین نفسیات نے ایک زیادہ جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس تعریف میں اس کردار کی جس سے ذہانت کا مظاہرہ ہوتا ہے صرف ایک ہی نہیں بلکہ متعدد خصوصیات کو شامل کیا ہے۔ تاہم کوئی بھی تعریف مکمل تعریف نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ذہانت ایک شخص کی مجموعی اہلیت ہوتی ہے۔ ذہنی اعمال اور نیز جسمانی اعمال یعنی کسی خاص دماغی کام کی انجام دہی یا کوئی ایسا کام جس میں پیچیدہ جسمانی کارکردگی

"ابتدائی نفسیات" سے ماخوذ — ضخامت 240 صفحات — قیمت : -/61

نوٹ : قومی اردو کونسل کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔
تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ — ادارہ

کی ضرورت ہے انھی کے ذریعے اس کا اظہار ہوتا ہے کسی اچھے انجینئر کسی چابکدست سرجن، کسی کامیاب تاجر یا کسی باصلاحیت مہتمم کو ذہانت کا اتنا ہی استعمال کرنا پڑتا ہے جتنا کسی اچھے عالم، کسی مشہور سائنس داں، کسی ہشیار ماہر قانون یا کسی مشہور ناول نگار کو کرنا پڑتا ہے۔ ذہانت ایک عام صلاحیت ہے جو اپنے آپ کو ان مختلف کارکردگیوں میں آشکار کرتی ہے جن کے اہل مختلف افراد ہوتے ہیں۔ تمام اشخاص کی ذہانت برابر نہیں ہوتی۔ بعض زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور بعض کم۔ ذہانت کا فرق ایک ایسی حقیقت ہے جسے صرف ماہرین نفسیات ہی نہیں جانتے۔ اس کا علم ماہرین نفسیات کے ذریعہ دریافت اور ثابت کیے جانے سے بہت قبل موجود تھا۔ لیکن اس کا بیان کیفی اصطلاحات کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ کسی شخص کے زیادہ یا کم ذہین، تیز یا کند ذہن ہونے کا اندازہ ٹھیک اسی طرح کیا جاتا تھا جس طرح کسی شخص کے لمبے اور پست قد ہونے، فربہ یا لاغر ہونے کا تاہم ایک کسی شخص کی لمبائی یا وزن کی پیمائش بھی کی جاسکتی تھی اور ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا تھا کہ وہ کتنا لمبا یا کتنا وزنی ہے۔ یہ بات اس لیے ممکن تھی کہ لمبائی یا وزن کی پیمائش کا معیاری پیمانہ ایجاد کیا جاچکا تھا۔ لیکن کوئی شخص یہ نہیں بتاسکتا تھا کہ ایک شخص کتنا ذہین یا کند ذہن ہے۔ ذہانت کی تمام تعریفیں کیفی تھیں۔ ذہانت کے فرق کو کمیتی طور پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ذہانت کی پیمائش کرنے کے لیے اس وقت تک کوئی پیمانہ نہ تھا جب تک ایک فرانسیسی ماہر نفسیات الفرڈ بینے نے ذہانت کے لیے اس طریق آزمایش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچایا جسے ذہانت کی جانچ کہا گیا۔

ذہانت کی آزمائش مختلف قسم کی کارکردگیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کارکردگیاں ذہانت کے عمل کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی انجام دہی کے لیے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، ذہانت کے عمل کا اظہار مختلف طریقہ کار میں ہوتا ہے۔ اس لیے ذہانت کی آزمایش میں مختلف قسم کے متعدد افعال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر ایک کو آزمایشی مد کہا جاتا ہے۔ اس طرح آزمایش متعدد مدوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر مد آزمایش کا ایک عنصر ہوتی ہے۔

پیدائش کے بعد عمر کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی جسم کی قوت وقامت ہی کی طرح بڑھتی ہے۔ ہم نے آموزش اور بالیدگی میں فرق بتایا ہے۔

جسم کی نشوونما، اس کی طاقت اور مشکل کاموں کو انجام دینے والی جسمانی صلاحیت میں اضافے کا انحصار بالیدگی پر ہوتا ہے۔ بالیدگی کو ہم نے نشوونما کا قدرتی عمل کہا ہے۔ شروع میں یہ عمل بہت ہی تیزی سے واقع ہوتا ہے لیکن بتدریج اس کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ سن بلوغ کے بعد یہ عمل کم وبیش اپنی تکمیل کو پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے۔ ذہانت بھی بالیدگی کے اسی عمل سے متاثر ہوتی ہے۔

جس طرح عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح ذہانت کی صلاحیت بھی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ ذہانت کی قوت کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہوتا ہے کہ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ کاموں کو کرنے کی کہاں تک صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی ابتدائی خوردسالی میں ایک بچہ صرف بہت آسان کام انجام دے سکتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے ویسے ہی ویسے وہ زیادہ سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسئلوں کو حل کرنے کا اہل ہوتا جاتا ہے۔ بینے (Binet) نے اپنی آزمایش کے لیے متعدد مدیں تیار کیں، ہر ایک مد ایک خاص مسئلہ کی حامل تھی مدوں کی ترتیب ان کی دشواری کے اعتبار سے کی گئی تھی۔ نسبتاً سادہ اور آسان مدوں کے بعد وہ مدیں شامل کی گئی تھیں جن میں زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل درپیش تھے۔ مد کی شکل کا تعین کرنے میں اس بات کا حساب لگایا گیا تھا کہ ایک خاص عمر کے بچوں کے فیصد سے کتنے اس مد میں کامیاب ہوسکتے تھے۔ جس مد میں ایک ہی عمر کے 60 تا 70 فیصد بچے کامیاب ہوئے تھے اسے اس عمر کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔ اس طور سے ہر عمر کے لیے پانچ چھ مدیں مقرر کی گئیں تھیں۔ ان میں سے جس عمر کے لیے جو مد مخصوص کی گئی تھی اس عمر کے دو تہائی لڑکے اور اس سے کم عمر کے بہت کم لڑکے اس میں کامیاب ہوئے تھے اس سے زیادہ عمر کے بہت زیادہ لڑکوں نے اسے حل کرلیا تھا۔

مختلف عمر کے لیے آزمائش کی مختلف مدیں مقرر کرنے کے بعد بینے نے اس بچے کی جس کی آزمایش کی گئی تھی ذہنی عمر کا حساب لگایا۔ مثلاً اگر کسی لڑکے نے ان تمام مدوں کو پاس کرلیا جو آٹھ سال والوں کے لیے مخصوص تھیں تو اس کی ذہنی عمر آٹھ سال سمجھی گئی۔ اگر اس کی تاریخی عمر بھی آٹھ سال تھی تو اس لڑکے کو اوسط ذہانت کا حامل قرار دیا گیا۔ وہ آٹھ سال کے اوسط بچے کی ذہانت رکھتا تھا۔ تاریخی عمر وہ عمر ہے جو پیدائش کے لمحہ سے سالوں اور مہینوں میں ناپی جاتی ہے۔ تاریخی عمر اور ذہنی عمر کے موازنہ سے اس بات کا پتہ چل جاتا تھا کہ آیا وہ لڑکا ذہانت میں ٹھیک اوسط، اوسط سے کم یا اوسط سے زیادہ ہے۔

بعد میں ذہنی عمر اور تاریخی عمر کا موازنہ ذہنی عمر مینٹل ایج (ام۔اے۔) اور تاریخی عمر کرونولوجیکل ایج (سی۔اے۔) کے درمیان ایک تناسب نکال کر کیا گیا۔ یہ تناسب ایک عدد کو دوسرے عدد سے تقسیم کرکے نکالا جاتا ہے۔ تقسیم کے نتیجے کو خمسہ یا خارج قسمت کہتے ہیں۔ اگر 6 کو 3 سے تقسیم کیا جاتا ہے تو خارج قسمت 2 ہوگا اور اگر 3 کو 6 سے تقسیم کیا جاتا ہے تو خارج قسمت 5. ہوگا۔ اسی طرح جب تناسب نکالنے کے لیے ام۔اے۔ کو سی۔اے۔ سے تقسیم دیا گیا تو ایک خارج قسمت حاصل ہوا۔ مثال کے طور پر، اگر ایک لڑکے کا ام۔اے۔ 9 سال

تھا اور سی.اے. 6 سال تو خارج قسمت 1.55 ہوگا۔ اگر دونوں برابر تھے تو خارج قسمت 1 ہوگا۔ اگر سی.اے. ام.اے. سے زیادہ ہوگا تو خارج قسمت 1/سے کم یعنی ایک کا کسر ہوگا۔ بڑا خارج قسمت، یعنی 1/سے زیادہ، برتر ذہانت کو ظاہر کرے گا۔ چھوٹے خارج قسمت یعنی 1/سے کم کا مطلب کمتر ذہانت ہوگی۔ اس طرح ام.اے./سی.اے. کے خارج قسمت کو قدر ذہانت انٹیلجنس کوشنٹ یا آئی.کیو. کہا گیا ہے۔ خارج قسمت جو 1/سے کم ہے وہ ایک کسر ہوگا۔ کوئی خارج قسمت جو ایک سے زیادہ ہوتا ہے وہ ایک مکمل عدد نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ام.اے. = 8 اور سی.اے. = 6 تو ام.اے./سی.اے. 1.33 کے برابر ہوگا۔ لیکن ایک مکمل عدد زیادہ قابل فہم ہوتا ہے۔ اس لیے خارج قسمت کو 100 (سو) سے ضرب دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح قدر ذہانت نکالنے کا مشہور فارمولا وجود میں آیا یعنی

آئی کیو = ام.اے./سی.اے. X100

بینے کی آزمائشوں کی مختلف زبانوں میں نظرثانی کی گئی اور اسے اپنایا گیا۔ کسی آزمائش کو اپنانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس آزمائش کی مدوں میں اس طرح کی ترمیم کی جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے پس منظر کے مطابق ہو جائیں جن کے لیے وہ آزمائش مخصوص ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی مد میں کسی غیر مانوس شئے کا نام یا کوئی ایسی چیز شامل ہو جسے اکثر افراد نہ جانتے ہوں۔ کچھ مدیں کسی ایک خطے میں زیادہ مشکل اور دوسرے میں کم مشکل ہوسکتی ہیں۔

بینے کی آزمائش کا تصرف جو سب سے زیادہ مشہور ہوا ٹرمین نے امریکہ میں کیا تھا اور بعد میں ٹرمین اور میرل دونوں نے مل کر کیا۔ ٹرمن میرل آزمائش دو برس کی عمر سے لے کر سنِ بلوغ تک کی ذہانت کی پیمائش کرتی ہے۔ اس میں بیشتر عمروں کے لیے چھ مدات رکھی گئی ہیں۔ ہر ایک مد میں کامیاب ہونے پر ایک شخص کو دو مہینوں کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ کسی شخص کے ام.اے. کا تعین کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ کس عمر کے تمام مدوں کو وہ پاس کر لیتا ہے۔ چونکہ اس سے کم عمر کی مدیں نسبتاً آسان ہوتی ہیں اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان تمام مدات میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ان سب پر کوشش کرنا اس کے لیے ضروری نہیں سمجھا جاتا اس شخص کو پہلے وہ مدات دی جاتی ہیں جو اس کی تاریخی عمر سے ایک یا دو سال کم عمر والوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ اگر وہ اس عمر سے متعلق تمام مدات میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے اس عمر سے مزید نیچے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ان میں یا ان میں سے چند ایک مدوں میں ناکام ہوتا ہے تو اس سے اور کم عمر والی مدات پر کوشش کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی عمر کے لیے مقرر تمام مدات میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے اس عمر کے لیے پورا اسکور ملتا ہے اسکور اسے ان مدات کے لیے ملتا ہے جو اس عمر سے اوپر والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ فرض کیا ایک 9 سال کا بچہ اس عمر کی تمام مدات میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نیز وہ دس سال کی مدات بھی ٹھیک طور سے کر لیتا ہے۔ گیارہ سال والوں کے لیے مخصوص دو مدات میں اسے کامیابی ہوتی ہے اور بارہ سال کی مدات میں سے ایک میں تیرہ سال کی تمام مدات میں وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ اس کا کل اسکور دس سال یا 120 مہینے، ان کے علاوہ 4 مہینے اور 2 مہینے یعنی اس کی ذہنی عمر 126 مہینے ہوگی۔ اس کا سی.اے. 9 سال یا 108 مہینے ہے۔ اس کا آئی کیو ہوگا:

$$\frac{126}{108}\times 100=116.66$$ یا 117

□□□

جامع التذکرہ (جلد اول)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال وکوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرائے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری
تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" نظم ونثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت دستیاب ہے۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-066 110

اردو خبرنامہ

علامہ اقبال پر دوروزہ قومی سیمینار

● الہ آباد، 8 جنوری۔ حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد میں 7 جنوری 2007 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے دوروزہ قومی سیمینار'' علامہ اقبال: رہبرِ انسانیت'' کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے افتتاحی جلسے کا آغاز شعبۂ اردو کی لکچرر زرینہ بیگم کی پیش کردہ حمد باری تعالیٰ اور رسم گل پوشی سے ہوا۔ ادارے کی پرنسپل ریحانہ طارق نے خصوصی مہمانوں اور دیگر شرکا کا خیر مقدم کیا اور علامہ اقبال کو حقیقی معنوں میں سچا محب وطن بتاتے ہوئے ان کے اشعار پیش کیے جو ہندوستانی تہذیب وتمدن، یکجہتی اور پیغامِ انسانیت سے متعلق تھے۔

اس موقع پر پروفیسر عبدالحق نے اپنے کلیدی خطبے میں اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اقبال کی الہ آباد سے وابستگی پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ الہ آباد یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی لٹ کی سند سے سرفراز کیا تھا۔ اکبر الہ آبادی سے اقبال کی گہری دوستی اور دلی تعلقات رہے۔'' ترانۂ ہندی'' کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس سے بہتر نظم کسی اور زبان میں مفقود ہے۔ انھوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ اقبال نے 1932 میں جنیوا میں'' لیگ آف نیشن'' کے قیام کے وقت کہا تھا کہ اس کا نام'' لیگ آف ہیومنٹی'' ہونا چاہیے۔ اشتراکی نظام بکھرنے کی پیش گوئی بھی بہت پہلے اقبال کر چکے تھے۔ اپنے خطبے میں اس بات کا انکشاف کیا کہ اقبال پر تقریباً 3000 کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں اور ہر سال 30-25 کتابیں منظرِ عام پر آتی ہیں جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔

الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر. جی. ہرشے صاحب نے اقبال کی دوراندیشی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے پیغامِ انسانی کی حمایت پر زور دیا اور کہا کہ اگر اقبال کے لفظوں میں'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستان'' بنانا ہے تو ہمیں جذبۂ ایثار سے کام لینا ہوگا، قربانیاں دینی ہونگی۔ اقبال کی الہ آباد سے وابستگی کے حوالے سے انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ان کے پیغام کو آگے بڑھانے کی پہل کا اعلان کیا۔ مزید اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کی ترقی وتوسیع کے لیے لوگوں کو کوشاں ہونے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا کہ کسی زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور اردو زبان ایسی سیکولر زبان ہے جو کسی ایک خطّے تک محدود نہیں جب کہ دیگر زبانیں صرف اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔

اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر عبدالقادر جعفری صدر شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی نے بھی علامہ اقبال کی شاعری وشخصیت پر خیالات پیش کیے۔ محترمہ رشیدہ خان نے'' اقبال میری نظر میں'' کے تحت اقبال کے تصورات آزادی پر روشنی ڈالی۔

رسم تشکر ادارے کی مینیجر تزئین احسان اللہ اور نظامت کے فرائض محترمہ ناصحہ عثمانی لکچرر شعبۂ اردو نے ادا کیے۔ یہ دوروزہ سیمینار 4 جلسوں میں منقسم تھا، جس میں'' اقبال کا پیغام انسانیت اور انسان کامل''،'' اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی وحب الوطنی''،'' اقبال کی شاعری میں خودی کا مقام اور تصور شاہین'' اور'' اقبال اور مکمل نظام حیات'' جیسے موضوعات شامل تھے۔ ان موضوعات پر جھارکھنڈ رانچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر قاضی عبدالہادی، رخسانہ ہادی، مولانا آزاد کالج کولکاتا کے ڈاکٹر شہنواز شبلی، الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر شبنم حمید، لکھنؤ سے ڈاکٹر طاہرہ خاتون، عبدالقادر جعفری، راجستھان سے محمد صادق علی، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج کے شعبۂ عربی کی ڈاکٹر رفعت عشرت، ڈاکٹر ندرت محمود، شعبۂ تاریخ کی ڈاکٹر یوسفہ نفیس، شعبۂ ہندی کی ڈاکٹر حسینہ بانو، شعبۂ فارسی کی ڈاکٹر شبانہ عزیز، اردو سے ناصحہ عثمانی، زرینہ بیگم، شمیمہ یاسمین، الہ آباد ڈگری کالج سے شہناز صبیح، ریسرچ اسکالر محمد کاشف، زیبا اعظمی، جاوید نظر اور ہادی رہبر نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر این. آر. فاروقی، صدر شعبۂ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی نے اپنے اختتامی خطبے میں اقبال کے نظریۂ خودی اور فلسفۂ حیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور 29 دسمبر 1930 میں الہ آباد میں اقبال کے دیے ہوئے خطبے پر اظہار خیال کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان سے متعلق لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

(ڈاک سے)

انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں "سر سید لیکچر"

● نئی دہلی، 8 دسمبر۔ آج ہر ضلعے اور ہر قصبے میں ایک جانشینِ سر سید کی ضرورت ہے، صرف مضامین لکھ دینے یا تقاریر کر دینے سے کچھ نہیں ہوگا، بلکہ عمل اور مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے اگر آپ ایسا کر سکتے ہیں تو یہی سر سید احمد کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ماہر تعلیم اے. آر. شیروانی نے انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں منعقد سر سید لیکچر کے دوران اپنے صدارتی خطبے میں کیا جس کا انعقاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ پروگرام کا آغاز شرافت اللہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا جب کہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے صدر صفدر حسین خاں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں سر سید احمد کی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اے. ایم. یو. اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے عزم کا اظہار کیا نیز تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نظامت ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری فصیح اللہ نے کی۔

اے. آر. شیروانی نے اپنی صدارتی تقریر میں مزید کہا کہ سر سید کی تحریریں آج بھی اپنی افادیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے مشن کے تئیں اتنے سنجیدہ تھے کہ ملک کے کونے کونے میں گئے اور کہیں ہائی اسکول قائم کرایا تو کہیں مدرسہ۔ اے. آر. شیروانی نے کہا کہ اگر سر سید کو سچا خراج عقیدت پیش کرنا ہے تو ہمیں ان کے کام کو آگے جاری رکھنا ہوگا۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سر سید کی علی گڑھ تحریک کسی سیاسی یا تعلیمی تحریک کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی جامع اور شعوری تحریک کی علامت تھی جس کا مقصد تہذیب کا ایک نیا تصور دے کر سماج میں ایک بڑا انقلاب لانا تھا۔ انھوں نے نہ صرف آنے والے خطرات سے ہمیں آگاہ کیا، بلکہ نئے امکانات اور امیدیں بھی جگائیں۔

پروفیسر ایس. ایم. عزیز الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ سر سید کا ایک بہت اہم کارنامہ "آثار الصنادید" ہے جس میں انھوں نے 12ویں سے 18ویں صدی تک دہلی کے تمام تاریخی سرمایے کا ریکارڈ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کیا۔ ان کی توجہ تاریخ کی جانب بھی تھی۔ اگر آج "آثار الصنادید" نہ ہوتی تو ہم اس وقت کی بہت سی تاریخی عمارتوں کے بارے میں ناواقف ہوتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کو مل کر "آثار الصنادید" پر کام کرنا چاہیے۔ یہ سر سید کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ "آثار الصنادید" کا ترجمہ ہندی میں بھی ہونا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 10 مئی 2007 سے 1857 کے انقلاب کے 150 سال پورے ہونے کے موقع پر جشن شروع ہونے والا ہے اس لیے اکبری بیگم کی مسجد کا نشان پھر سے قائم کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

آخر میں اے. ایم. یو. اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سینئر نائب صدر ڈاکٹر وسیم احمد خان نے تمام مہمانان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ ایسوسی ایشن سر سید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ اس موقع پر شرکت کرنے والی اہم شخصیات میں خواجہ شاہد، نفیس عباسی، رحمن اللہ، وصی احمد نعمانی، عذرا سلطانہ، مسز شیروانی، محمد حق، سہیل احمد، احتشام الرحیم خاں، صبا اسرار وغیرہ شامل تھے۔ (روزنامہ "راشٹریہ سہارا"، نئی دہلی)

غالب آج بھی زندہ ہیں کل بھی زندہ رہیں گے

● حیدرآباد، 28 دسمبر۔ غالب اپنی ناقابل فراموش شاعری کے سحر کے باعث دوسو دس سال سے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے کیونکہ وہ "شاعر زیست" ہیں۔ ان خیالات کا اظہار گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ممتاز تلگو شاعر ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں یوم غالب کے سلسلے میں منعقد یک روزہ بین الاقوامی سیمینار "غالب شاعر زیست" میں اپنے افتتاحی کلمات کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے اس سیمینار کی صدارت کی۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ اپنی شاعرانہ عظمت کے باعث ہی غالب کا انداز بیان دوسروں سے جدا ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے اس بین الاقوامی سیمینار کو ایک مقصدی سیمینار قرار دیتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان اور منتظمین کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر سی. نارائن ریڈی نے اپنے دور طالب علمی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے عظیم ورثے کے تحفظ کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہماری تہذیب مغرب کے منفی اثرات سے متاثر ہو رہی ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے اس موقع پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب "غالب: دیوان نعت و منقبت" کی رسم رونمائی انجام دینے کے بعد اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو ہندوستان ہی نہیں برصغیر کی زبان ہے اور اس

زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اردو یونیورسٹی مصروف ہے۔ پروفیسر پٹھان نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ غالب کے یوم ولادت کے موقع پر بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے لیکن اس طرح کے سیمینار اب یونیورسٹی کی روایت بنتے جا رہے ہیں۔ پروفیسر پٹھان نے ڈاکٹر سید تقی عابدی سے اردو یونیورسٹی کے مجوزہ کلچرل سنٹر میں ان کی ذاتی لائبریری کے نادر مخطوطات بطور عطیہ دینے کی خواہش ظاہر کی جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے قبول کرتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کی اس پیشکش کو اپنے لیے ایک اعزاز قرار دیا۔ ابتدا میں پروفیسر ایس. اے. وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات و انچارج شعبۂ تعلقات اور ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے مہمانان خصوصی ڈاکٹر سی. نارائن ریڈی، پروفیسر مغنی تبسم اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کو نذرانۂ گل اور یادگاری تحفہ پیش کیا۔

سیمینار کا پہلا سیشن پروفیسر مغنی تبسم کے زیر صدارت منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر مسرت جہاں، مضطر مجاز، ڈاکٹر فاطمہ پروین اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے جب کہ طالب خوندمیری نے اپنی نظم ''مرزا غالب'' سے اس سیشن کا آغاز کیا اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ظفر الدین، صدر شعبۂ ترجمہ نے انجام دیے۔ ظہرانے کے بعد پروفیسر قمر رئیس کی صدارت میں اس سیمینار کے دوسرے سیشن میں شمس الہدیٰ دریابادی، ڈاکٹر مظفر شاہ میری، پروفیسر ایس. اے. وہاب اور ریحانہ سلطانہ نے غالب کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اپنے صدارتی خطبے میں اس سیمینار کو انتہائی کامیاب اور بامقصد قرار دیتے ہوئے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر قمر رئیس نے بھی اپنے صدارتی خطاب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پٹھان کی جانب سے اس طرح کی فکر انگیز محفلوں کے انعقاد کو فال نیک قرار دیتے ہوئے غالب شناسی کے موضوع پر عالمی سطح کے مذاکرے کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر نجم السحر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر شجاعت علی راشد کے کلمات تشکر پر اس سیمینار کا اختتام ہوا۔

(روزنامہ ''آزاد ہند''، کولکاتا)

داغ دہلوی پر کل ہند سیمینار

● پنچکولہ، 18 جنوری۔ ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ اور روٹری کلب انبالہ کے اشتراک سے گذشتہ دنوں داغ دہلوی اور ان کی ادبی خدمات پر ایک کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ یہ سیمینار رکمنی دیوی ہال انبالہ میں ہوا۔ جس کا افتتاح عزت مآب ڈاکٹر اے. آر. قدوائی، گورنر، ہریانہ نے کیا جب کہ جناب پھول چند ملانا (وزیر تعلیم، ہریانہ) افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو، نئی دہلی نے داغ اور ان کی خدمات پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ تقریب کا آغاز داغ کی غزلیات سے ہوا جو محترمہ نیلم پرمار نے اپنی دل کش آواز میں ساز کے ساتھ پیش کیں۔ بعد ازیں داغ اور ان کی ادبی خدمات پر مقالے پیش کیے گئے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، جناب شاہد ماہلی، ڈاکٹر کمار پانی پتی، جناب مہندر پرتاپ چاند کے نام شامل تھے۔

اس موقع پر گورنر ہریانہ ڈاکٹر اے. آر. قدوائی نے داغ کا تعلق ہریانہ سے بتاتے ہوئے ان کے کلام اور زبان و بیان کی تعریف کی اور فرمایا کہ آج کی تقریب میں داغ کی غزلیات سننے کے بعد محسوس ہوا کہ ایک شام داغ ہی کے نام سے منعقد ہونی چاہیے جس میں محترمہ نیلم پرمار کے علاوہ اور بھی فنکاروں کو مدعو کیا جائے اور جس میں صرف داغ ہی کی غزلیں ترنم سے پیش کی جائیں۔

وزیر تعلیم ہریانہ جناب پھول چند ملانا نے فرمایا کہ داغ اردو کے ایک ایسے شاعر تھے جن کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ داغ کیونکہ فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے اس لیے وہ ہریانہ ہی کے فرزند تھے، ان کی خدمات کو منظر عام پر لانے کے لیے اس طرح کے اور بھی سیمینار منعقد کیے جائیں۔ سکریٹری اکادمی جناب کشمیری لال ذاکر نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گورنر صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے عنقریب ہی ''ایک شام داغ کے نام'' کا انعقاد اکادمی کی جانب سے کیا جائے گا۔ آپ نے روٹری کلب کے لیے ایک اردو مرکز کی بھی پیش کش کی اور یہ بھی کہا کہ انبالہ کی ادبی روایات اور یہاں کے باذوق سامعین کا خیال رکھتے ہوئے انبالہ میں ایک ہند و پاک مشاعرے کا انعقاد بھی کیا جائے گا۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض جناب شمس تبریزی نے انجام دیے۔

(ڈاک سے)

معاصر اردو ناول: سمت و رفتار

● نئی دہلی، 12 جنوری۔ کسی بھی سماج کو کھلا رکھ کر ہی زندہ رکھا جا سکتا ہے اور کھلا سماج وہ ہے جہاں بولنے اور اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ کوئی بھی بند سماج زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا اور سوویت روس کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمینار بعنوان ''معاصر اردو ناول: سمت اور رفتار'' کے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کیا۔ اس اجلاس کی صدارت برصغیر کے معروف افسانہ نگار جوگندر پال نے کی جب کہ افتتاح پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے جب کہ اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ اندر کمار گجرال نے کہا کہ ان کی سوچ پر منشی پریم چند نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند تحریک نے قومی یکجہتی قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور جیسے جیسے یہ تحریک کمزور پڑی فرقہ پرستی بڑھتی گئی۔ گجرال نے کہا کہ انھیں لگتا ہے کہ نثر میں ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں زیادہ کام ہو رہا ہے۔ گوپی چند نارنگ کے اس بیان پر کہ ''ایمرجنسی کے دوران کوئی اچھا ناول سامنے نہیں آیا'' انھوں نے کہا کہ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ اس وقت لکھنے والوں نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ اس دور میں ذہن بند ہو گئے تھے اور دوستوں نے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کھل کر غور کرنے اور گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو ادب میں اب افسانوی ادب اور ناول میں خاموش انقلاب آ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1935 کے بعد تقریباً نصف صدی تک اردو فکشن کی دنیا میں افسانے کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس نے اردو کو قاری سے جوڑا۔ ادب میں پیش گوئی کرنا اچھی بات نہیں ہے لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ صدی اردو ناول کی صدی ہونے جا رہی ہے اور آج ہر افسانہ نگار بڑا ناول لکھنے کا خواہش مند ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے ناول کو استحکام بخشا، اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ میں نوجوان فنکاروں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک بار پھر اردو اور قاری کے رشتے کو جوڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ناول میں آئیڈیالوجی کے لیے پھر سے دروازہ کھل گیا ہے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے جوگندر پال نے کہا کہ کہانی میں نظر کو سکوڑنا پڑتا ہے جب کہ ناول میں نظر کو وسعت دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فلسفہ یا تاریخ بیان کرنے سے کہانی یا ناول نہیں بنتا۔ کہانی کی زبان صرف کردار پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اسے پورے معاشرے کو گرفت میں لینا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ناول لکھنے کا کوئی ایک طریقہ نہیں بلکہ سب کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ ناول اور کہانی وہی ہے جس میں پڑھنے والے کو اپنی وارداتیں نظر آئیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ناول اس لیے نہیں لکھا جاتا کہ اس میں زیادہ لکھنا ہوتا ہے اور کہانی میں کم لکھنا پڑتا ہے۔ لمبے لمبے ناول بولتے زیادہ ہیں اور کہتے کم ہیں۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ افسانوی ادب میں افسانے پر بہت کام ہوا ہے۔ افسانہ نمبر بھی شائع ہوئے اور اس پر تحقیقی اور علمی کام بھی ہوئے لیکن ناول پر بہت کم کام ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکادمی نے ناول پر یہ سیمینار منعقد کیا ہے۔ متین امروہوی نے اس موقع پر اندر کمار گجرال، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جوگندر پال اور پروفیسر قمر رئیس کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

''خدا کی بستی'' پر سیمینار

● 27 جنوری، پٹنہ۔ ''خدا کی بستی'' تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے ناولوں میں ایک اہم ناول ہے جو تقسیم کے بعد پاکستانی معاشرے اور وہاں کے متوسط طبقے کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح پریم چند نے اپنے عہد اور معاشرے کی حقیقتوں کو ناول میں پیش کیا تھا اسی کی توسیع شوکت صدیقی نے پاکستان میں اپنے ناول میں کی۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر اسرائیل رضا نے ''خدا کی بستی'' پر منعقد سیمینار کے صدارتی خطبے میں کیا۔ یہ سیمینار شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ کے طلبہ کی جانب سے ممتاز ناول نگار شوکت صدیقی اور ان کے ناول 'خدا کی بستی' پر کیا گیا تھا جس میں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر اسلم آزاد (ایم۔ایل۔سی۔ حکومت بہار) اور مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر اشرف جہاں اور ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے شرکت کی۔ سیمینار کا آغاز ناظم جلسہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے شوکت صدیقی کو اپنے عہد کا نمائندہ ناول نگار قرار دیا۔ اس سیمینار میں طلبہ اور طالبات کی جانب سے 13 مقالے پڑھے گئے جن میں شفیہ جمیل ''شوکت صدیقی، خدا کی بستی کی روشنی میں''، شاہد صدیقی ''خدا کی بستی پر ایک نظر''، افشاں بانو ''خدا کی بستی کا تنقیدی جائزہ''، نصرت پروین ''خدا کی

بستی میں کردار نگاری''، فوزیہ تبسم ''خدا کی بستی کا پلاٹ''، فائزہ احمد ''موت اس کی ہے''، سلمیٰ زریں ''خدا کی بستی میں پاکستانی معاشرہ''، نیر سلطانہ ''خدا کی بستی میں فضا آفرینی''، فوزیہ ترنم ''خدا کی بستی کا تنقیدی مطالعہ''، مستفیض احمد ''خدا کی بستی میں تقسیم ہند کے بعد کا سماج'' اور فرزانہ خاتون ''خدا کی بستی پر ایک تبصرہ'' کے مقالے خاص طور پر پسند کیے گئے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر جاوید حیات نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ شعبے میں اساتذہ اور طلبہ کی یہ کوشش ایک اجتہادی کوشش ہے۔ انھوں نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی اور خدا کی بستی کے انتخاب کو سراہتے ہوئے طلبہ کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سورج دیو سنگھ اور ڈاکٹر اشرف جہاں نے بھی اظہار خیال کیا۔

(روزنامہ ''قومی تنظیم''، پٹنہ)

سات زبانوں کے سافٹ ویئر مفت تقسیم

● نئی دہلی، 26 جنوری۔ متعدد مرکزی وزارتوں نے اردو سمیت سات زبانوں میں سافٹ ویئر ٹولز اور فونٹس کے سی.ڈی. مفت عوامی تقسیم کے لیے تیار کیے ہیں۔ اطلاعاتی تکنالوجی کے وزیر دیاندھی مارن نے اردو کے علاوہ پنجابی، مراٹھی، ملیالم، اڑیہ، کنڑ اور آسامی زبانوں کی سی.ڈی. کا کل یہاں اجرا کیا۔ اس موقع پر وزیر داخلہ شیوراج پاٹل، بھاری صنعتوں اور سرکاری صنعتی اداروں کے وزیر سنتوش موہن دیو، محنت اور روزگار کے وزیر آسکر فرنانڈیز امور خارجہ کے وزیر مملکت ای. احمد، وزیر اعظم کے دفتر کے وزیر مملکت پرتھوی راج چوہان، تجارت کے وزیر مملکت جے. رام رمیش مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی دیگر اہم شخصیات شامل تھیں۔ اس موقع پر مسٹر دیاندھی مارن نے کہا کہ بقیہ 12 سرکاری زبانوں کے لیے سافٹ ٹولز اور فونٹس کی تیاری اور ترتیب کا عمل جاری ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ بنگالی اور گجراتی زبانوں کے سافٹ ویئر اور فونٹس آئندہ تین ماہ کے اندر جاری کر دیے جائیں گے اور باقی ماندہ 9 زبانوں کے لیے سافٹ ویئر اس سال کے آخر تک جاری کر دیے جائیں گے۔ مارن نے مزید کہا کہ ان کا خواب ہے کہ ایک زبان بولنے والا شخص بھی دوسری زبان کے جاننے والے شخص کے ساتھ بات چیت کرنے کے قابل بن جائے۔ ایسا آلہ تیار کرنے کے لیے آرٹی فیشیل انٹلی جنس کے شعبوں میں تکنالوجیاں مطلوب ہیں۔ جیسے بولنے والے متن، ترجمہ کرنے والی مشین اور متن کو صوتی شکل دینے والا عمل۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے اطلاعاتی تکنالوجی کے محکمے نے پانچ پروجیکٹ شروع کیے ہیں۔ اس کے لیے کم وبیش 23 تعلیمی اور تحقیقی ترقیاتی ادارے اور نجی ادارے پہلے ہی سے کنسورشیم میں کام کر رہے ہیں۔ تمام مرکزی وزرا جنھوں نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کیا، انھوں نے متفقہ طور پر اطلاعاتی تکنالوجی کے محکمہ (ڈی.آئی.ٹی.) کو سی.ڈی.اے. کے ذریعے ان تمام زبانوں کی سی.ڈی. تیار کرنے کے لیے مبارکباد دی اور اس کی تعریف کی۔ سنٹر فار ڈیولپمنٹ آف ایڈوانس کمپیوٹنگ اطلاعاتی تکنالوجی کے محکمے کے تحت ایک خودمختار ادارہ ہے۔ جاری کی گئی سی.ڈی. میں عمومی طور پر درج ذیل خصوصیات شامل ہیں: کی بورڈ سے ہی اصل فونٹ کی چھپائی، اصل فونٹ کے لیے ملٹی فونٹ کی بورڈ، اوپن ٹائپ فونٹس کے لیے یونی کوڈ، کمپلینٹ، جنرل فونٹ کوڈ اور اسٹوریج کوڈ کنورٹر، بھارتیہ اواد کے لوکلائزڈ ورژن، ہجے کی جانچ، ذولسانی لغت، ٹرانس لیشن ٹول لنگویج، نیوز چیک۔ ان زبانوں کے ٹولز اور فونٹس کو ویب سائٹ www.idle.in اور www.ilde.gov.in سے آن لائن مفت لوڈ کیا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ ''سالار''، بنگلور)

ٹیکساس یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کی تعلیم

● آسٹن (ٹیکساس)، 19 دسمبر۔ امریکہ کی ٹیکساس یونیورسٹی نے نئے سال سے اردو کی تدریس کے لیے خصوصی شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آسٹن میں واقع ٹیکساس یونیورسٹی نے 2007 کے تعلیمی سال کے دوران اردو تعلیم و تدریس کا پہلا پروگرام شروع کرنے کا یہ منصوبہ مرتب کیا ہے جس کے لیے طلبہ کے انتخاب کا عمل شروع کیا جا رہا ہے۔ ایسے طلبہ کو اولین ترجیح دی جائے گی جو اردو یا ہندی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں۔ آسٹن، ٹیکساس یونیورسٹی میں جنوب ایشیائی ادارے کے ڈائرکٹر جیمس برو نے اس پروجیکٹ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا کہ امریکی قومی سلامتی تعلیمی پروگرام نے اردو اور ہندی تعلیم و تدریس کے لیے آسٹن میں واقع ٹیکساس یونیورسٹی کو منتخب کیا ہے تاکہ بیرونی زبانوں کی تدریس کا پہلا قومی پروگرام شروع کیا جا سکے۔ اس پروگرام کے آغاز کے لیے قومی سلامتی تعلیمی پروگرام کی طرف سے اس ادارے کو رواں تعلیمی سال کے لیے سات لاکھ امریکی ڈالر (3 کروڑ 20 لاکھ روپے) مہیا کیے گئے ہیں۔ مسٹر جیمس برو نے کہا کہ امریکی حکومت قومی سلامتی کے مفادات کے پیش نظر برصغیر کی ان زبانوں پر اپنے شہریوں کو مہارت دلانا چاہتی ہے۔ امریکی کانگریس نے 1991 میں قومی سلامتی تعلیمی پروگرام شروع کیا تھا تاکہ امریکیوں کو دیگر زبانوں کی تعلیم فراہم کرتے ہوئے عالمی سطح پر

مختلف زبانوں کے ذریعے متعلقہ ملکوں سے موثر رابطہ قائم کیا جا سکے نیز امریکیوں کو دیگر ملکوں کی زبان اور ثقافت سے خاطر خواہ آگہی حاصل ہو سکے۔ اس پروجیکٹ کے تحت ماضی میں عربی، چینی کوریائی، فارسی اور روسی زبانوں میں تعلیم و تدریس کے پروگرام شروع کیے گئے تھے جس کے بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ جیمس برو نے کہا کہ سردست ہم اس پروگرام کے لیے اردو ہندی سے واقف طلبہ کو تلاش کر رہے ہیں لیکن طلبہ کی تعداد میں علاقائی توازن برقرار رکھنے کے لیے ایسے طلبہ کا انتخاب بھی کیا جائے گا جنھیں جنوب ایشیائی امور سے دلچسپی ہے اور جو اردو و ہندی میں ابتدائی تعلیم شروع کرنا چاہتے ہیں چنانچہ ایسے امیدواروں کے انتخاب کا عمل بھی جاری ہے۔ اس دوران یونیورسٹی کی طرف سے لسانی تدریس کے گرمائی کیمپ بھی منعقد کیے جائیں گے جہاں اردو ہندی سے بالکل ناواقف امریکی طلبہ کو ابتدائی تعلیم مہیا کی جائے گی۔ اس ''فلیگ شپ'' پروگرام کے کلیدی شعبے میں یونیورسٹی کے ایشیائی تعلیمی شعبے کے موجودہ اراکین ہی ہوں گے لیکن کسی اضافی شعبے کے لیے ہندوستان یا پاکستان سے ماہرین کے تقررات بھی ممکن ہیں۔ ''فلیگ شپ'' لسانی پروگرام کے طلبہ کو ہندی اور اردو زبانوں میں روانی کے ساتھ ماحولیات، دیہی ترقیات، عالمگیری نظام اور مذاہب جیسے عصر حاضر کے موضوعات پر روانی کے ساتھ بات چیت کرنے کی تعلیم دی جائے گی۔ یونیورسٹی کے اس پروگرام میں اردو ہندی تدریس کے ساتھ طلبہ کو ان کے کلیدی شعبوں میں تعلیم بھی مہیا کی جائے گی۔

(روزنامہ ''سیاست''، حیدرآباد)

اردو اکادمی ملازمین کو سرکاری ملازمین کا درجہ

● پٹنہ، 13 جنوری۔ بہار اردو اکادمی کے ملازمین کو سرکاری ملازمین کا درجہ مل گیا ہے۔ اس سلسلے میں آج وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار نے اردو اکادمی کے فروغ کے معاملے پر منعقد میٹنگ میں یہ اعلان کیا اور اردو اکادمی کے ملازمین کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے۔ میٹنگ کے بعد اکادمی کے وائس چیئرمین جناب شفیع مشہدی، جناب عبدالواحد اور سکریٹری جناب شکیب ایاز کافی خوش نظر آئے۔ اردو اکادمی کو 2 قومی ایوارڈ شروع کرنے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے شروع کیا جائے گا جب کہ دوسرا ایوارڈ غلام سرور کے نام پر ہوگا۔ مولانا عبدالکلام آزاد ایوارڈ اردو ادب میں گراں قدر خدمات کے لیے پٹنہ کے پروفیسر عبدالمغنی کو بعد از مرگ اور پروفیسر مغنی تبسم کو دیا جائے گا، جب کہ صحافت کے لیے غلام سرور ایوارڈ عشرت علی صدیقی لکھنؤ اور خورشید انور عارفی کو دیا جائے گا۔ یہ دونوں ایوارڈ 51 ہزار روپے کے ہوں گے۔ اس میٹنگ میں اردو اکادمی کے لیے 15 لاکھ 60 ہزار کے منصوبے کو منظوری دے دی گئی ساتھ ہی موجودہ اردو اکادمی کے رکھ رکھاؤ کے لیے بھی تقریباً 5 لاکھ روپے جاری کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اکادمی کی تیسری منزل پر ایم. پی. علی انور کے فنڈ سے عبدالقیوم انصاری آڈیٹوریم بنانے پر بھی اتفاق ہو گیا ہے۔ ادھر اقلیتی فلاح سے متعلق 15 نکاتی پروگرام عمل درآمد کمیٹی کی پیش رفت رپورٹ کا بھی معائنہ وزیر اعلیٰ نے کیا۔ 15 نکاتی عمل درآمد کمیٹی کے چیئرمین محمد شریف قریشی نے کہا کہ وزیر اعلیٰ نے مدرسوں کی جدید کاری پر زیادہ زور دینے کو کہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدرسے میں سائنس کی پڑھائی پر زور دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ وظیفے مہیا کرانے پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اس میٹنگ میں اردو اکادمی کے عہدیداران کے علاوہ اقلیتی فلاح کے وزیر مملکت جناب منظر عالم، ایم.ایل.سی. پروفیسر اسلم آزاد نے شرکت کی۔ اس موقع پر پروفیسر اسلم آزاد نے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار کے سامنے اردو کے فروغ کا موقف پوری مضبوطی کے ساتھ رکھا اور وزیر اعلیٰ نے اردو کے فروغ کے لیے موثر اقدامات کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

احمد آباد میں انجمن فروغ ادب کا قیام

● احمد آباد، 28 جنوری۔ احمد آباد کے مضافاتی علاقے سارنگپور، گومتی پور، رکھیال اور باپونگر وغیرہ آزادی کے بعد تقریباً چار دہائیوں تک اردو تحریکات اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کے مرکز رہے لیکن گذشتہ دو تین دہائیوں سے کوئی ادبی انجمن موجود نہ ہونے کی وجہ سے علمی و ادبی سرگرمیاں یکسر ختم ہو گئیں اور ادبی فضا میں ایک جمود طاری رہا۔ اس جمود کو توڑنے کی غرض سے 28 جنوری کو گومتی پور علاقے میں ایک میٹنگ طلب کی گئی اور ''انجمن فروغ ادب'' کے نام سے ایک بزم تشکیل دی گئی جس کے صدر انیس منیری، نائب صدر عبدالرشید ابہام، سکریٹری وفا جونپوری، جوائنٹ سکریٹری معظم ہاشمی اور خازن محمد مستقیم متفقہ رائے سے منتخب کیے گئے اور دس ممبران بھی مقرر کیے گئے۔

مذکورہ بالا انجمن اردو زبان و ادب اور ثقافت کی ترویج و اشاعت کے لیے مختلف سطحوں پر سرگرم عمل رہے گی۔

(ڈاک سے)

شمس الرحمن فاروقی کو ڈی.لٹ

● حیدرآباد، 28 فروری۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے وائس چانسلر جناب اے.ایم. پٹھان کے مطابق اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد محترم شمس الرحمن فاروقی کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر یونیورسٹی نے ڈی.لٹ کی ڈگری سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اعزازی ڈگری یونیورسٹی کے سالانہ اجلاس کے موقعے پر عالی جناب ارجن سنگھ کے ہاتھوں دی جائے گی۔ اس سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 2002 میں شمس الرحمن فاروقی صاحب کو ڈی.لٹ کی ڈگری سے نواز چکی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فاروقی صاحب کو ان کی تنقیدی کتاب ''شعر شور انگیز'' جو چار جلدوں میں کل 2500 صفحات پر مشتمل میر تقی میر کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ ہے، 1997 میں ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی انعام 'سرسوتی سمان' سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

(روزنامہ ''آبشار''، کولکاتا)

قطر کا عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ 2007

● نئی دہلی، 31 جنوری۔ گیارھویں مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ کے لیے اردو کے ممتاز اسکالر، نقاد اور ماہر اسلوبیات پروفیسر مغنی تبسم کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپئے نقد، طلائی تمغے اور سپاس نامے پر مشتمل ہے جو ہر سال دوحہ قطر کی ایک شاندار تقریب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ ہندوستان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا، جوگندر پال، جیلانی بانو، سریندر پرکاش، پروفیسر گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز، نثار احمد فاروقی، قاضی عبدالستار اور پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، مختار مسعود، بانو قدسیہ، محمد خالد اختر، شوکت صدیقی، مستنصر حسین تارڑ، عبداللہ حسین اور ہاجرہ مسرور کو پیش کیا جا چکا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم کے نام کا اعلان پینل آف ججز نے کیا جس کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اراکین جیوری پروفیسر محمد حنیف کیفی، پروفیسر محمد شاہد حسین اور پروفیسر ابن کنول تھے۔ اس سال پاکستان میں یہ ایوارڈ کراچی کے مشہور ناول نگار اسد محمد خاں کو دیا گیا ہے۔

(ڈاک سے)

کرن دیسائی کو بوکر انعام

● نئی دہلی۔ نامور مصنفہ انیتا دیسائی کی بیٹی کرن دیسائی نے محض 35 سال کی عمر میں شہرۂ آفاق مین بوکر انعام جیت کر ادب کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اپنے دوسرے ناول ''انہیریٹنس آف لاس'' کے لیے انھیں 50 ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم والے اس مایہ ناز اعزاز کا حقدار قرار دیا گیا۔ ان کا پہلا ناول ''ہلابلوان دی گوادا آرچرڈ'' کو ادبی حلقوں میں داد و تحسین سے نوازا گیا تھا۔ 2000 میں بوکر انعام جیتنے والی مارگریٹ ایٹ ووڈ کے بعد کرن دیسائی یہ انعام حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ 2006 کے بوکر انعام کے ججوں کے پینل کی سربراہ ممتاز سوانح نگار اور مبصر ہرمیون لی تھیں۔ دیگر ججوں میں نامور شاعرہ اور ناول نگار سیمون آرمیٹیج، ایوارڈ یافتہ ناول نگار کینڈیا میک ولیم، نقاد انتھونی کوین اور اداکارہ فایونا شا جیسی اہم ہستیاں شامل تھیں۔ ایوارڈ کے موقع پر دی گئی ایک ضیافت کے دوران ہرمیون لی نے کہا ''میرے خیال میں انیتا دیسائی کو اپنی بیٹی پر ناز ہونا چاہیے۔ جس نے بھی انیتا دیسائی کے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ کرن نے اپنی ماں کی کتابوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ماں اور بیٹی کی تصنیفات کا موضوع بھارت نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں پھیلی ہندوستانی برادری کے تجربات ان کا ماخذ ہیں۔

(''برٹش جائزہ''، نئی دہلی، اکتوبر۔نومبر 2006)

مختصرات

● اٹاوہ، 24 دسمبر۔ کمپیوٹر موجودہ دور میں انسانی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا ہے اس کے بغیر ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس زمانے میں جو لوگ کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں ہونگے وہ ترقی کی دوڑ میں پچھڑ جائیں گے۔ لائق مبارکباد ہیں وہ حضرات جنھوں نے کمپیوٹر کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا اور اٹاوہ میں اتنا شاندار کمپیوٹر سینٹر قائم کر کے معیاری تعلیم و تربیت کا نظم قائم کیا۔'' ان خیالات کا اظہار مسلم تعلیمی سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے تعاون سے قائم شدہ ایس.آئی.آئی.ٹی. کے جلسۂ اسناد کو خطاب کرتے ہوئے سابق سیلز ٹیکس کمشنر جناب شیو رام سنگھ نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ قوموں کی ترقی کا راز اس کے نونہالوں کی اچھی تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔ معروف سماجی کارکن اور تاجر مسٹر بی.کے. ٹنڈن نے کہا کہ SIIT کے ذریعے چلایا جا رہا یہ کورس اہل اٹاوہ کے لیے کسی وردان سے کم نہیں ہے۔

بھارت سرکار کی دو وزارتوں کا مشترکہ یہ ڈپلوما نو جوانوں کو روزگار سے جوڑنے میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔ سینٹر ڈائرکٹر طارق ششی نے اس موقع پر سینٹر کا تعارف پیش کیا۔ پہلا، دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کو انعامات واسناد تقسیم کی گئیں۔ (ڈاک سے)

● بھاگلپور، بہار۔ بہار کے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار کی صدارت میں منعقدہ میٹنگ میں بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ نے اردو، ہندی، انگیکا اور انگریزی میں 99 کتابوں کے قلمکار ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے لیے پندرہ ہزار روپئے بطور انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

(ڈاک سے)

● کٹک، 24 دسمبر۔ گذشتہ 24 دسمبر 2006 کو ''اتکل ساہتیہ سماج'' کے رام چندر بھون میں ''سوا گتیکا'' کے زیر اہتمام سالانہ کثیر لسانی کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا جس میں، ہندی، اڑیا، اردو، سنسکرت، انگریزی، پنجابی، تیلگو اور گجراتی زبان کے شعرا نے کلام پیش کیا۔ دوسرے سیشن میں چار زبانوں کے قلم کاروں کو ''سوا گتیکا ایوارڈ 2006'' سے سرفراز کیا گیا۔ سوا گتیکا ایوارڈ سلیکشن کمیٹی نے اردو کے شاعر و ادیب ''ترویج'' اور بچوں کا رسالہ ''جگنو'' کے مدیر جناب خاور نقیب کو مذکورہ ایوارڈ دے کر ان کی پذیرائی کی۔

(ڈاک سے)

● اندور، یکم فروری۔ یوم جمہوریہ کے موقع پر جن چیتنا ابھیان کے زیر اہتمام اندور کے راجواڑے میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ صدارت معروف وکیل نثار احمد نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض اعجاز انصاری نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی ستیہ نارائن ستن تھے۔ اس موقع پر ادب میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں شری شانتی ناتھ روپاین اور رشید شادانی کو اعزاز سے نوازا گیا۔

ایم.ایل.اے. اشونی جوشی نے کہا کہ اندور کے راجواڑے میں منعقد ہونے والا مشاعرہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے جسے کل کا مورخ فراموش نہیں کر سکے گا۔ ستیہ نارائن ستن نے اردو اور ہندی کی ترقی پر زور دیتے ہوئے اسے گنگا جمنی تہذیب کے فروغ سے تعبیر کیا۔ جوائنٹ کنوینر سید واحد علی اور جاوید عرشی نے شعرا کا استقبال کیا۔ مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعرا شریک ہوئے احمد کمال پروازی، ممتاز راشد، جاوید عرشی، جلیل جالب، اعجاز انصاری، دیم ملک، نیلو سنگھ، رشید قریشی، ڈاکٹر ضیا رعنا، سفیان قاضی، اشوک ساحل، ڈاکٹر قمر سرور، اقبال اشہر، رئیس نظامی اور فرید بابا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 2 فروری۔ جامعہ نگر، طاہر اپارٹمنٹ میں شاہد میر کی آمد پر اعزازی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ پروفیسر اختر الواسع اور جناب اسد رضا بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ ڈاکٹر خالد محمود نے شاہد میر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شاہد میر اگرچہ سائنس کے استاد ہیں مگر شعر و ادب سے ان کا غیر معمولی تعلق ہے۔ انھیں موسیقی پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ اردو میں راگوں سے متعلق مضامین لکھنے والے چند ایک ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس نشست کی نظامت عمیر منظر نے کی۔ شاہد میر کے علاوہ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول، اظہر غوری ندوی، اسد رضا، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، فصیح اکمل قادری، معین شاداب اور عمیر منظر۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

● علی گڑھ، یکم فروری۔ جشن جمہوریہ کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقد مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر نسیم احمد نے کہا کہ اردو زبان و ادب نے تحریک آزادی کو پروان چڑھانے میں جو کلیدی کردار ادا کیا ہے وہ ہندوستان کی شاید ہی کسی دوسری زبان نے ادا کیا ہو۔ وائس چانسلر نے کہا کہ دستور ہند کو مرتب کرنے والوں میں اس ادارے کے طلبہ بھی برابر کے شریک تھے اور فرزندان علی گڑھ نے اپنی نظموں، غزلوں اور تحریروں سے عوام کے دلوں میں آزادی کا جوش پیدا کیا اور قومیت اور وطنیت کے جذبے کو فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو محض ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کا بہترین وسیلہ بھی ہے اور انسان دوستی کی علامت بھی۔ شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر قاضی افضال حسین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ شعری نشست کی صدارت ممتاز شاعر پروفیسر شہریار اور نظامت سراج اجملی نے کی۔ نشست میں جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: شہریار، زبیر رضوی، شاہد میر، منظور ہاشمی، شہاب الدین ثاقب، خورشید اکبر، شارق کیفی، معظم علی معظم، نعمت اللہ خاں شیروانی، عابد علی عابد، راشد انور راشد، سریش کمار، زویا زیدی، معراج رعنا، سرفراز خالد، اسیر امام، کمال اختر، بصیر الحسن وفا، ظہیر ساحل، ظہیر الحق اور سید امین اشرف۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 3 فروری۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جس نے ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھایا اور ملک کی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار آج لال قلعہ کے سبزہ زار میں دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد مشاعرۂ جشن جمہوریت کا افتتاح کرتے ہوئے جھارکھنڈ کے گورنر سید سبط حسن رضی نے کیا۔ مشاعرے کی صدارت دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ سبط رضی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اردو محض زبان ہی نہیں بلکہ محبت، عاشقی، اتحاد، جدوجہد، جمہوریت اور سیکولرازم کی تحریک ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کے دوران متعدد شعرا نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جمہوریت میں مشاعروں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ شاعر سماج کا آئینہ ہوتے ہیں اور وہ ہمیں بار بار یاد دلاتے ہیں کہ ابھی بہت آنکھوں میں آنسو ہیں اور بہت لوگوں کے پیٹ خالی ہیں۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ یہ ایک تاریخی مشاعرہ ہے جس کا انتظار پورے سال سامعین ہی نہیں شاعر بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہی وہ تاریخی مقام ہے جہاں دیوان خاص اور دیوان عام میں علم وتہذیب کی پرورش ہوئی اور یہیں اردوئے معلی کا جنم ہوا۔ یہاں کی فضا میں آج بھی غالب، ذوق، داغ اور بہادر شاہ ظفر کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے مہمان شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے آغاز میں سدھانشو بہوگنا گروپ نے علامہ اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور علی سردار جعفری کا ''ترانہ اردو'' پیش کیا۔ (روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، نئی دہلی)

رسم اجرا

عصری تحریریں

● جموں، 13 دسمبر۔ معروف افسانہ نگار دیپک بدکی کی تصنیف: عصری تحریریں (تنقیدی مضامین اور تبصرے) کی رسم رونمائی 12 دسمبر 2006 کو جموں میں انجام پائی۔ اس کتاب کو میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سری نگر نے شائع کیا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں پچاس کتابوں پر لکھے گئے تبصروں کے علاوہ اردو کے نامور ادیبوں مانک ٹالا، گلزار، برج پریمی اور وریندر پٹواری پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ دیپک بدکی آج کل چیف پوسٹ ماسٹر جنرل، جموں وکشمیر سرکل کے عہدے پر فائز ہیں اور دو افسانوی مجموعوں ''ادھورے چہرے'' اور ''چنار کے پنجے'' کے مصنف ہیں۔ (ڈاک سے)

گل نا آشنا

● کرلا، ممبئی، 10 دسمبر۔ نور پرکار کی نئی تصنیف ''گل نا آشنا'' کی رونمائی سنیچر 9 دسمبر 2006 کو ہندوستانی پرچار سبھا ہال میں جناب سبھاش سمپت، ٹرسٹی و اعزازی سکریٹری ہندوستانی پرچار سبھا کے ہاتھوں انجام پائی۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے نور پرکار کی نئی تصنیف اور اردو کی خدمات کے لیے مبارکباد پیش کی۔ جناب سلام بن رزاق نے کہا کہ نور پرکار نے اپنی کہانیوں میں خطۂ کوکن کے مسلم معاشرے کو پیش کیا ہے۔

جناب الیاس شوقی نے کہا کہ ''گل نا آشنا'' میں برصغیر کے نئے شعرا کے ساتھ ساتھ اردو کے اساتذۂ فن پر بھی مضامین ہیں۔ جناب عبدالاحد ساز نے کہا کہ ''گل نا آشنا'' میں جو مضامین ہیں انھیں انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں نور پرکار کا منفرد اسلوب جھلکتا ہے۔ (ڈاک سے)

سنگم

● حیدرآباد، 8 جنوری۔ سینئر صحافی، ادیب، افسانہ نگار جناب کرار کاظمی کی اصلاحی اور معیاری کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ''سنگم'' کی رسم اجرا 5 جنوری کو 4 بجے شام ایوان فاطمہ دار الشفا میں جناب حسین راوش قونصل جنرل اسلامی جمہوریہ ایران کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ انھوں نے کرار کاظمی کو ایک دردمند انسان، حساس ادیب اور ایک بے باک صحافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ پچھلے 47 سال سے اپنے موقر ہفت روزہ ''بانگ درا'' کے ذریعے اعلیٰ صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ابتدا میں اردو کے ممتاز شاعر و ادیب جناب مظفر مجاز نے کتاب ''سنگم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ سنگم کرار کاظمی کی اصلاحی اور معیاری کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے قوم وملت کو خواب سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی فکر ونظر کا دائرہ وسیع تر ہے ان کی کہانیوں کی زبان سلیس اور آسان ہے ادیب کے ساتھ ساتھ وہ ایک سینئر صحافی بھی ہیں اس لیے ان کی کہانیوں میں خوب صورت بیانیہ انداز بھی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار نے ''سنگم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کرار کاظمی کے افسانوں میں تخیل کی بلند پروازی اور شدت احساس ہے۔ کینیڈا سے آئے ہوئے مشہور افسانہ نگار جناب رضا الجبار نے کرار کاظمی کی کہانیوں پر روشنی ڈالی جناب تقی عسکری، نیوز ایڈیٹر، آل انڈیا ریڈیو نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور جناب اظہار کاظمی تاج دار نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب میں ادبی شخصیات کے علاوہ خواتین وحضرات کی کثیر تعداد موجود تھی۔

جانے والوں کی یاد

کملیشور

● ہندی کے مشہور ادیب اور دانشور کملیشور 27 جنوری 2007 کو اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ وہ 74 برس کے تھے۔ ان کی آخری رسوم اگلے دن دوپہر لودھی روڈ پر واقع شمشان گھاٹ میں ادا کی گئیں۔ ان کے پس ماندگان میں بیوی اور ایک بیٹی ہے۔ 27 جنوری کو رات ساڑھے آٹھ بجے، سورج کنڈ میں واقع ان کی رہائش گاہ پر اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور اسپتال لے جانے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ پہلے سے دل کے مریض تھے۔

کملیشور کی پیدائش 6 جنوری 1932 کو مین پوری (اتر پردیش) میں ہوئی تھی۔ 1954 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ہندی میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد انھوں نے دوردرشن میں اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ 1996 سے 2002 تک وہ ہندی کے مشہور اخبار روزنامہ ''بھاسکر'' سے وابستہ رہے۔ وہ ہندی روزنامہ ''دینک جاگرن'' کے ایڈیٹر اور دوردرشن کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل بھی رہے۔ انھوں نے کئی فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں جن میں سارا آکاش، موسم، رجنی گندھا، آندھی، مسٹر نٹور لال اور چھوٹی سی بات جیسی فلمیں شامل ہیں۔ انھوں نے ٹیلی ویژن سیریل درپن، چندر کانتا، ایک کہانی اور یوگ کی اسکرپٹ لکھنے کے علاوہ کئی ڈاکیومنٹری فلموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ 1995 میں انھیں پدم بھوشن اعزاز سے نوازا گیا تھا اور 2003 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے۔ ان کے علاوہ بھی انھیں کئی اعزازات اور انعامات ملے تھے۔

کملیشور اس تہذیبی روایت میں رچے بسے تھے جو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے باہمی میل جول سے وجود میں آئی تھی اور جس کی بنیاد محبت اور رواداری پر تھی۔ ان کا وسیلۂ اظہار ہندی زبان تھی لیکن وہ ہندی کے قارئین کی طرح اردو کے قارئین میں بھی بے حد مقبول تھے۔ ان کی بہت سی کہانیاں اردو میں ترجمہ ہوئیں اور کچھ مدت پہلے ان کی مشہور کتاب ''کتنے پاکستان'' بھی اردو میں آگئی تھی۔ اس کے مترجم ڈاکٹر خورشید عالم صاحب ہیں۔ ان کی اکثر تحریروں کی طرح اس کتاب میں بھی ان ذہنی اور جذباتی رویوں کو سامنے لایا گیا ہے اور ان کے غیر انسانی پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جو انسان اور انسان کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں اور اسے تعصب اور تشدد کے مصاروں کا قیدی بناتے ہیں۔

کملیشور اپنی تحریروں ہی میں نہیں اپنی عملی زندگی میں بھی ہر طرح کے تعصبات سے دور تھے۔ مذہبی تنگ نظری، سیاسی موقع پرستی، وہ تمام چیزیں جو انسانی شرف کے منافی تھیں، کملیشور ان کے مخالف تھے اور ان کی یہ مخالفت کبھی کمزور نہیں پڑی۔ کملیشور اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، انھیں بہترین خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم ان کے انسانیت نوازفکری آدرشوں کو اپنے سامنے رکھیں۔

محسن بھوپالی

● کراچی، 17 جنوری۔ نامور شاعر محسن بھوپالی کراچی میں بدھ کی صبح انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 74 برس تھی۔ محسن بھوپالی طویل عرصے سے علیل تھے۔ نمونیا کی وجہ سے وہ گذشتہ تین روز سے بی۔ این۔ ایس۔ شفا ہسپتال میں زیر علاج تھے، جہاں بدھ کی صبح ان کا انتقال ہوگیا۔ اس سے قبل 1988 میں ان کے گلے کے کینسر کا کامیاب آپریشن کیا گیا تھا۔ اس کے بعد انھیں بولنے میں دشواری ہوتی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے زندگی کے معمولات جاری رکھے۔

محسن بھوپالی کی پیدائش 1932 میں بھوپال میں ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان نقل مکانی کر کے لاڑکانہ منتقل ہوگیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد حیدرآباد میں رہائش اختیار کی۔ آخر میں وہ کراچی منتقل ہوگئے تھے۔ محسن بھوپالی پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے اور سندھ حکومت میں ایگزیکیٹو انجینئر کے عہدے سے 1991 میں ریٹائر ہوئے۔ وہ دس کتابوں کے خالق تھے۔ 1950 کے عشرے میں انھیں اس وقت شہرت ملی جب تحریک پاکستان کے رہنما عبدالرب نشتر نے ایک جلسے میں ان کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

نیرنگیِ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

یہ شعر زبان زد عام ہوگیا اور محاورے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

محسن بھوپالی کی شاعری میں ادب اور معاشرے کے گہرے مطالعے کا عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے جاپانی ادب کا اردو میں ترجمہ کیا اور ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی۔ **(روزنامہ ''آزاد ہند''، کولکاتا)**

حفیظ آتش

● امروہہ، 12 جنوری۔ غزل اور نظم کے امین معروف شاعر حفیظ آتش جو تقریباً دو ماہ سے بستر علالت پر تھے ایک ہفتہ قبل انھیں دہلی کے اروِن اسپتال میں داخل کیا گیا تھا جہاں ان کے سبھی چیک اپ وغیرہ کیے گئے لیکن 11 جنوری 2007 کو ان کی حالت نازک دیکھ کر اسپتال سے انھیں آکسیجن پر امروہہ بھیج

دیا گیا۔ امروہہ اپنے آبائی مکان محلہ ملانہ (چوداری) میں 11 جنوری کی شام مغرب کے قریب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ 12 جنوری کو بعد نماز جمعہ نماز جنازہ جامع مسجد میں ادا کی گئی۔ مرحوم کے جنازہ میں شہر کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور بعد تدفین ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ ان کی عمر تقریباً 68 سال تھی۔ مرحوم کے پسماندگان میں 7 لڑکیاں اور 2 لڑکے ہیں۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا"، نئی دہلی)

واصف عابدی

● سہارنپور، 17 جنوری۔ معروف شاعر واصف عابدی 16 جنوری کو صبح 8 بجے رحلت کر گئے۔ نماز جنازہ امام بارگاہ انصاریان میں اور تدفین دینی والے قبرستان میں ہوئی۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر 75 سال تھی۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی ایک اہلیہ کا انتقال 40 دن قبل ہوا تھا۔ دونوں بیویوں سے مرحوم کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ پیشہ سے کچہری میں منشی تھے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے بیمار چل رہے تھے اب کافی دن سے صاحب فراش تھے۔ ان کے انتقال پر شہر جمعیۃ علما کے علاوہ اردو مرکز عروج ادب، انجمن محبان اردو، انجمن بزم احباب اور انجمن ترقی پسند مصنفین و سہیوگ سماجی تنظیم نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا"، نئی دہلی)

او. پی. نیر

● ممبئی، 28 جنوری۔ مشہور موسیقار او. پی. نیر جس نے "اڑیں جب جب زلفیں تیری" اور "یہ چاند سا روشن چہرہ" جیسے کلاسیکل گانوں سے شہرت حاصل کی، کا 27 جنوری کو تھانے میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 81 سال کے تھے۔

26 جنوری 1926 کو لاہور میں پیدا ہونے والے اومکار پرساد نیر نے 1948 میں پہلی بار فلم کنیز میں موسیقی دی لیکن گرودت کی فلم "آر پار" (1954) سے انھوں نے پہلی بار کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے نیا دور، کشمیر کی کلی اور تم سا نہیں دیکھا، جیسی فلموں میں یادگار موسیقی دی۔

انھوں نے جالندھر میں آل انڈیا ریڈیو سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ انھیں موسیقی کا جنون اس حد تک تھا کہ اس کے لیے کالج بھی چھوڑ دیا۔ تقسیم ملک کے بعد ان کا خاندان لاہور سے امرتسر آگیا جس کے بعد وہ ممبئی آگئے۔ فلم "آسمان" سے نیر کو ایک آزاد میوزک ڈائرکٹر کے طور پر بریک ملا۔ گرودت کی آر پار اور مسٹر اینڈ مسز 55، جو زبردست ہٹ رہیں اور نیر کا سکہ جم گیا۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ او. پی. نیر کے انتقال سے فلمی دنیا ایک عظیم موسیقار سے محروم ہوگئی۔

(روزنامہ "انقلاب"، ممبئی)

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔

گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔

اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

تبصرہ وتعارف

آزادی کے بعد اردو نظم (ایک انتخاب)
انتخاب اور ترتیب: شمیم حنفی، مظہر مہدی
صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: مخمور سعیدی، J-3/141C، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی-92

قومی اردو کونسل، اردو زبان و ادب کی جو ہمہ جہت خدمات انجام دے رہی ہے ان میں ایک اہم خدمت اردو کے قدیم اور جدید نثری اور شعری ادب کی اشاعت بھی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، آزادی کے بعد کہی گئی نظموں کے انتخاب پر مشتمل ہے، انتخاب ژرف نگاہی اور ذمہ داری کے ساتھ کیا گیا ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جو نظمیں منتخب کی گئی ہیں وہ انتخاب میں جگہ پانے والے شعرا کے فکر و فن کی بخوبی نمائندگی کرتی ہیں۔ کتاب میں 67 شعرا اور شاعرات کی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں کی ترتیب میں شعرا کے سال پیدائش کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ایک Age group کے لوگ ساتھ ساتھ آگئے ہیں اور اس طرح ایک نسل کے شاعروں کو ایک ساتھ پڑھنے کی سہولت فراہم ہوگئی ہے۔ فہرست میں ہر شاعر کا سال پیدائش اور اگر وہ وفات پا چکا ہے تو اس کا سال وفات بھی، اس کے نام کے ساتھ درج ہے۔ بعض شاعروں اور شاعرات کے معاملے میں، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق جدید تر نسل سے ہے، یہ التزام قائم نہیں رکھا جا سکا ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے سنین کی عدم دستیابی رہی ہوگی۔ اس ضمن میں اگر تھوڑی محنت اور کر لی جاتی تو اچھا ہوتا۔ ترتیب کا یہ انداز الفبائی ترتیب سے بہتر ہے جس میں زمانی پہلو یکسر پس پشت جا پڑتا ہے۔

کتاب کا نام ''آزادی کے بعد اردو نظم'' ہے جو متقضی ہے کہ اس میں وہی نظمیں شامل کی جاتیں جو آزادی کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن جوش ملیح آبادی کی جن پانچ نظموں سے کتاب کا آغاز ہوا ہے، ان میں سے پہلی چار نظمیں آزادی سے پہلے کی ہیں اور ان میں سے نظم ''شکست زنداں کا خواب'' تو خود ہی گواہی دے رہی ہے کہ وہ آزادی سے پہلے کی ہے اور غلام ہندوستان میں کہی گئی ہے۔ جوش صاحب آزادی کے کچھ برس بعد پاکستان چلے گئے تھے اور ان کی عمر کا آخری حصہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں گزرا تاہم ان کے شاعرانہ عروج کا زمانہ چونکہ ان کے قیام ہندوستان کے زمانے ہی کو کہا جا سکتا ہے اور انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر آزادی کے سورج کو طلوع ہوتے بھی دیکھا، اس لیے اس کتاب میں ان کی شمولیت تو چنداں محل نظر نہیں البتہ ن م راشد اور فیض کی شمولیت ضرور غور طلب ہے۔ یہ دونوں اردو کے مستند اور محترم شاعر ہیں، ان کی شاعری کا آغاز بھی غیر منقسم ہندوستان میں ہوا تھا لیکن اب ان کی پہچان پاکستانی شعرا کے طور پر ہے، ہندوستانی شعرا کے طور پر نہیں۔

کتاب دو رسم الخط میں چھاپی گئی ہے، اردو اور دیوناگری۔ دیوناگری میں مشکل اردو الفاظ کے معنی بھی درج ہیں۔ امید ہے نظموں کا یہ انتخاب اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ان حلقوں میں پسند کیا جائے گا جو اردو شاعری کے قدر شناس ہیں۔

کلیات مصحفی (جلد ششم)
مرتب: نورالحسن نقوی
صفحات: 398، قیمت: -/255 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: محمد عمر رضا، E-224، مہاندی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی پیدائش 1745 میں ہوئی تھی۔ ان کا وطن امروہہ تھا۔ کم و بیش 80 سال کی عمر میں 1825 میں ان کا انتقال ہوا۔ مصحفی نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ متعدد نثری رسالے اور اردو و فارسی شاعروں کے تین تذکرے — عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا — تالیف کیے۔ ان کا شعری سرمایہ کم و بیش چالیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا سارا کلام اب منظر عام پر آچکا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اپنے ایک اہم منصوبے کے تحت اٹھارھویں صدی کے اس اہم شاعر کے تمام شعری سرمایے کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں از سر نو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

مصحفی نے اپنا دیوان ششم 1224 ہجری میں مکمل کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 63 برس کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ (مکتوبہ: 1243 ہجری) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ زیر تبصرہ کلیات اسی نسخے پر مبنی ہے۔ کلیات مصحفی کی اس چھٹی جلد میں کل 566 غزلیں ہیں۔ علاوہ ازیں آخر میں ایک مخمس، آٹھ قطعات، سات رباعیات اور ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔

کلیات کی ابتدا میں نورالحسن نقوی کا تحریر کردہ ''حرف آغاز'' اور ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون بعنوان ''مصحفی کا کارنامۂ خاص اردو شاعری میں'' ہے۔

اٹھارھویں صدی کی دہلی میں جب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ امرا کا کسی کی مالی امداد کرنا تو کجا خود زندہ رہنے کے لالے پڑ گئے تو دہلی کے دیگر شاعروں کی طرح مصحفی نے بھی لکھنؤ کا سفر کیا تھا جہاں خارجیت اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ میر تقی میر جیسے شاعر کا انداز بھی بدلنے لگا تھا۔ مصحفی بھی لکھنؤ کی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ انھوں نے اپنی شاعری پر خارجیت کو کم از کم غالب نہیں ہونے دیا بلکہ لب و لہجے میں دہلی کی سادگی کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

مصحفی کی شاعری میں میر سوز کا انداز، میر تقی میر کا آہنگ اور سودا کا اسلوب بیان ہے جس سے ان کے کلام میں ہمہ رنگی پیدا ہو گئی ہے، اس کے باوجود مصحفی کا اپنا ایک الگ انداز ہے، ایک جداگانہ اسلوب ہے جس میں اعتدال اور توازن کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری داخلیت اور خارجیت دونوں کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ مصحفی نے یوں تو مثنویاں، قصیدے، رباعیاں اور مرثیے بھی لکھے ہیں لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے۔ انھوں نے اردو غزل کے لیے اظہار و بیان کا وہ لطیف پیرایہ تیار کیا جس کے بغیر تغزل کی تکمیل ممکن نہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ — ''مصحفی پہلا شاعر ہے جس نے تجربات اور احساسات کے مقابلے میں زبان اور طرز ادا کو اہمیت دی اور صوت و صورت کی خوبی اور شیریں الفاظ و تراکیب کا سہارا لیا۔'' (ڈاکٹر سید عبداللہ، مصحفی کا کارنامۂ خاص اردو شاعری میں، کلیات مصحفی، جلد ششم، ص۔22)

حاشیے میں مشکل الفاظ کے معانی اور تشریح طلب باتوں کی وضاحت و صراحت اہمیت کی حامل ہے۔

بے زبانوں کی دنیا/حیدر بیابانی

صفحات: 128، قیمت-/29 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: احمد کفیل، E-301، برہم پتر ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ 67

''بے زبانوں کی دنیا'' حیدر بیابانی کی چوالیس (44) نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام نظمیں جنگلی یا پالتو چرند و پرند اور پیڑ پودوں کو محور و مرکز بنا کر لکھی گئی ہیں جنھیں شاعر نے ''بے زبانوں کی دنیا'' کہا ہے۔ انسان اپنی عقل و خرد اور فہم و فراست کے باوجود کائنات کے دیگر ذی روحوں سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہے۔ اس حقیقت سے باشعور اذہان تو واقف ہیں لیکن ننھے اذہان کو اس راز سے واقف کرانے کے لیے بے زبانوں کی دنیا کے ماحول اور عادات و اطوار سے قریب تر کرنا نہایت ضروری ہے۔

حیدر بیابانی نے بچوں کے شعور کو بیدار کرنے، ذہن و فکر اور سوچ میں وسعت اور نکھار پیدا کرنے کے مقصد کے پیش نظر ہی یہ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں میں شکوہ جانوروں کا، ٹی پارٹی، خواب، جشن سال گرہ، دو چالاک، جنگل کا مور، چیونٹی، بدھو کوا، بندر کی کرنی، اونٹ، جنگل میں مشاعرہ، چوہے میاں کی شادی، گھوڑا، گدھے کی نوکری، پیاری بولیاں، مینڈک کی ناؤ، ہاتھی بھائی، اگر آزاد ہو جاؤں، خرگوش جادوگر، الیکشن، بلی کا پروگرام، چاند اور سورج، کالی گائے، چالاکی خرگوش کی، پھل دار پیڑ، چوہوں کی یونین، شہد کی مکھی، سیدھا سادا گدھا، طوطا بولے، تعلیم بڑی نعمت، پیڑ کی فریاد اور پھول کی دعا بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

بے زبانوں میں ظلم سہہ کر بھی اپنی وفاداری کا ہر دم پاس و لحاظ رکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ عقلمندوں سے عقلمندی اور دشمنوں سے حفاظت کے لیے ہمہ وقت چوکنا رہنا، اپنی خوبصورتی اور میٹھی بولیوں سے دلوں کو مسرور و مسحور کر لینے کی خاصیت یہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جنھیں حیدر بیابانی نے بچوں کے لیے عام فہم زبان اور سادہ لہجے میں بیان کیا ہے جس سے دلچسپی اور تجسس پوری نظم کے خاتمے تک برقرار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں زیادہ تر نظمیں چھوٹی بحروں میں ہیں جنھیں بچے آسانی سے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ ان نظموں کا انداز علامتی کے بجائے بیانیہ ہے جو بچوں کی ذہنیت اور دلچسپی کے عین مطابق ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے اور ان کی ذہنی تربیت کے تعلق سے شعری اور نثری اصناف میں بچوں کا خاطر خواہ ادب شائع کیا ہے۔ ''بے زبانوں کی دنیا'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

میرا سفر (شعری مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام

مترجم: شکیل شفائی۔ سنہ اشاعت 2004

صفحات: 80، قیمت:-/100 روپے

ناشر: مترجم۔ اے۔153، رام پرستھ، غازی آباد (یو۔ پی۔) 201011

مبصر: ڈاکٹر رئیس احمد، 1/1007 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110022

ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام (صدر جمہوریۂ ہند) کا یہ شعری مجموعہ ''میرا سفر'' سترہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ اصلاً یہ نظمیں تمل زبان میں

کہی گئی ہیں جنھیں ترجمے کے ذریعے تمل سے انگریزی اور انگریزی سے اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ انگریزی سے اردو کے مترجم کہنہ مشق شاعر شکیل شفائی ہیں۔ 'میرا سفر' جن آزاد نظموں پر مشتمل ہے ان میں— 'اخوت'، 'تلاش مسرت'، 'شکرانہ'، 'محزونی'، 'کائنات'، 'خدا'، 'پیغام'، 'کون'، 'بادل'، 'خودداری'، 'خواہش اجداد'، 'دست نادیدہ'، 'دیوار سنگ'، 'تکمیل'، 'حافظ'، 'اضطراب' اور 'اشک' شامل ہیں۔

متذکرہ نظموں کے عمیق مطالعے سے شاعر کے سوانحی احوال وکوائف پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ مختصر شعری مجموعہ منظوم خودنوشت سوانح کی شکل بھی اختیار کر گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام نظمیں مناظر فطرت اور علاقائی ماحول کی منظر کشی کے تناظر میں بہترین نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ نظمیں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نمونہ بھی پیش کرتی ہیں اور ملت و مذہب کے نام پر فتنہ وفساد برپا کرنے والوں کو اخلاق ومحبت اور انسانی مساوات کا پیغام بھی دیتی ہیں۔ نظم 'اخوت' کا یہ آخری مصرعہ ملاحظہ کریں:

ع نگاہِ رب میں مساوی ہے نسل انسانی

شاعر نظم 'محزونی' میں مدر ثریا کی بیماری کے باعث بے چین ومضطرب ہے اور بارگاہِ الٰہی میں مدر ثریا کی صحت یابی کے لیے دست بدعا ہے۔

چلو آؤ!
دعا کو ہاتھ اٹھائیں
الٰہی!
بخش دے تو جان اس کی
ضرورت ہے ابھی دنیا کو جس کی
سروں سے چھین مت سایہ تو اس کا
ہے جس کا نام نامی ماں ثریا

نظم 'خدا' خود کلامی اور مکالمہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس نظم میں ہمارے ملک میں مذہب وملت کے نام پر ہونے والے فسادات کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ شاعر کی دلسوزی نے اس نظم میں مزید سوز وگداز پیدا کر دیا ہے۔ شاعر نے نظم میں خداتعالیٰ کو بھی ایک کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو اپنے بندوں سے ہم کلام ہے۔ ذیل میں چند مصرعوں کے مطالعے سے شاعر کے انداز بیان اور پیش کردہ پیغام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فساد برپا ہوا امن کی فضاؤں میں
تو اعتبار بشر بٹ گیا دشاؤں میں
یہاں تو بھوک غریبی سے لوگ مرتے ہیں
تو قتل کس لیے اک دوسرے کا کرتے ہیں
کسی کا جرم تو یہ تھا کہ وہ مسلماں ہے
کسی کا دوش کہ بھگوان کا ثنا خواں ہے
نہ ان میں آپسی رنجش نہ دشمنی کوئی
بس ایک نام نے دونوں کی عافیت کھوئی
ہلاک جسموں کی تقسیم ساری یکساں تھی
مرے تو موت کی تکلیف سب کی یکساں تھی

"مرا خدا ہے یہ"
"بھگوان یہ تو میرا ہے"
پکار اٹھی تھیں روحیں
خدا کو غیظ آیا

"نہیں کسی کا نہیں میں، کہ تم درندے ہو
مجھے ہی رام، رحیم اور خدا میں بانٹ دیا
مرا سکون، مرا چین تم نے چھین لیا
کیا ہے قید مجھے دھرم کے شکنجے میں
تو پھر رہو یوں ہی بربادیوں کے پنجے میں
کہا تھا میں نے کہ خیمے لگاؤ الفت کے
پڑاؤ ڈال دیے تم نے جا کے نفرت کے
بنایا میں نے ہے اور آج کہہ رہے ہو تم
کہ وہ رحیم کے ہیں
ہم ہیں رام کے بندے
مرے بنائے ہوئے بھی نہیں رہے میرے

مجموعے میں شامل ایک نظم— 'بادل' بلندیِ فکر اور اخلاقیات کا عمدہ نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ 'بادل' میں پائی جانے والی فکری بلندی جہاں— ع 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں' کی مصداق ہے وہیں اس نظم کا پیغام— ع 'دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو' کی یاد دہانی کراتا ہے۔ فکری یہ بلند پروازی ملاحظہ کیجیے:

بادلوں سے اوپر بھی
میری فکر جاتی ہے
اور سوال کرتی ہے
یہ جہانِ ہست و بود
واقعی یہی ہے کیا
اصل منزلِ مقصود

بادلوں سی آزادی
کاش مجھ کو مل جائے
اور میں پہنچ جاؤں
لاحدود افق کے پار

ایک ایسی منزل میں
لامکاں کا روحانی
جیسے گوشۂ تنہا
اور پھر دعا مانگوں
بے نیاز ہستی سے
''ختم کر تماشا یہ
چھین لے ہوس ہم سے
اقتدار و طاقت کی
امن و آشتی دیدے
جلتی نوع انساں کو
پیار نوع انساں کا''

'خواہش اجداد' میں 'آگہی' میزائل کی تشکیل وتعمیر کو اپنی اولاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ 'دیوار سنگ' میں شاعر اپنے ہم وطنوں سے پیار، محبت اور یگانگت کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور فتنہ وفساد، بغض وعداوت اور مذہبی ونسلی تعصبات کو بھلا کر قومی یکجہتی پر زور دیتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کریں۔

فضا میں اڑتے ہوئے طائرانِ خوش الحان
جو بخشتے ہیں خوشی اور شعور آزادی
جہاں گلوں کی مہک ہے
پیام ربانی
یہاں بتاؤ کہ دیوار سنگ کیوں اٹھے؟

ہو میرے گرد مرے خواب کی حسیں تعبیر
ہے میرا خواب فراز وطن، فراز زمیں
سکون، امن و محبت رہیں یہاں پہ مکیں
تو اب بتاؤ یہ دیوار سنگ کیوں اٹھے

نظم 'اضطراب' میں شاعر نے خود کلامی کا انداز اختیار کیا ہے اور اپنے تخلیق کردہ میزائلوں مثلاً 'رودہنی'، 'آگنی'، 'پرتھوی'، 'آکاش' اور 'ترشول' کے مثبت ومنفی اور مفید ومضر اثرات کو غور وفکر کا موضوع بنایا ہے:

کیا یہ سب اسباب خوشی تھے؟
فیصلہ ان کا کون کرے گا

کیا میرے یہ کام بڑے تھے؟
میں نے فضا کی کھوج سنبھالی
علم و ہنر کی قدر بڑھائی
یا ایسے ہتھیار بنائے
جو بربادی ساتھ میں لائے
دل میں عجب ہیجان بپا ہے

'خودداری' اور 'اشک' ان دونوں نظموں میں شاعر نے ملک کے ہونہار بچوں کو ہمت وجوانمردی اور حوصلے کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھنے کا درس دیا ہے، ساتھ ہی مایوسی اور ناامیدی سے کوسوں دور رہنے کی تلقین ونصیحت کی ہے۔ یہ دونوں نظمیں۔

'جواں مرداں جوانمردی بیاموز زمرداں جہاں مردی بیاموز'

کی عکاس ہیں۔ ان نظموں سے یہ چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

ہم نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے
سر نے جھکنا چھوڑ دیا ہے

عہد رواں کے سنو جوانو
دیتا ہوں پیغام تمھیں
نقش اسے تم دل پر کر لو
پُر فریب مایوسی والے
دام سے نکلو
ہونہار طفلان خدا ہو
اپنی ذات سے اوپر اٹھو (خودداری)

مرے بچو!
رہو، ہوکر دلاور
یہی آنسو بنائیں گے قدآور (اشک)

یہ شعری مجموعہ ناشر ومترجم شکیل شفائی نے بڑے اہتمام اور سلیقے سے شائع کیا ہے۔ اردو زبان اور اس کے رسم الخط سے ناواقف قارئین کے لیے مجموعے کی دوسری جانب اس کے پورے متن کو من وعن دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کیا ہے۔ قارئین کی آسانی کے لیے حاشیے میں اردو زبان کے مشکل

الفاظ کے معانی و مطالب درج کیے گئے ہیں جن کی مدد سے اردو زبان اور رسم الخط سے ناواقف قارئین کو اشعار کی تفہیم میں مدد مل سکے گی۔ شکیل شفائی نے فنی چابکدستی اور عرق ریزی سے انگریزی سے اردو ترجمے کو فصیح و بلیغ بنا دیا ہے جس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ اس ترجمانی کے لیے مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب کے شروع میں عرض مترجم (حرف اوّل) کے علاوہ پروفیسر قمر رئیس (پیش لفظ) پروفیسر مظفر حنفی (ڈاکٹر عبدالکلام کا کلام بلاغت نظام) اور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد (نقد و نظر) کے تاثرات بھی ہیں۔ ان اصحاب کے نام کے ساتھ پروفیسر کافی تھا۔ پروفیسر کے ساتھ سابق کا سابقہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ادبی مقالات

مصنف: مولانا حامد حسن قادری

صفحات: 288، قیمت: -/225 روپے

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

مبصر: درخشاں زریں، شعبۂ اردو، خضر پور کالج، خضر پور، کولکاتا۔

''ادبی مقالات'' مولانا حامد حسن قادری کے تنقیدی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے قادری صاحب کی علمی لیاقت، عمیق تنقیدی نگاہ اور بے باک رائے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ قادری صاحب کو متعدد کلاسیکی اور جدید زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مختلف علوم مثلاً ادب، فلسفہ، تاریخ، مذہب، لسانیات اور سائنس وغیرہ پر بھی وہ اچھی گرفت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے علمیت کی ایک کرن پھوٹتی نظر آتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ''داستان تاریخ اردو'' جیسی کتاب لکھ کر انھوں نے اپنی پہچان قائم کی۔

مجموعے میں طویل و مختصر کل اٹھائیس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی نوعیت مختلف ہے۔ پہلا مضمون ''عربی مبین'' ہے جس میں عربی زبان کی ابتدا و ارتقا سے بحث کرتے ہوئے اس کے رسم الخط، صرف و نحو اور اس کی وسعت و ہمہ گیری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عربی دنیا کی سب سے قدیم زبان ہے جو ارتقا کے کئی منازل طے کرتی ہوئی لطیف اور فصیح شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ دوسرا مضمون ''انقلابی شاعری'' نئی شاعری پر موصوف کی بے باک رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی نظر میں انقلابی شاعری کے پس پردہ جس قدر شاعری کی روح سے چھیڑ چھاڑ کی گئی وہ کوئی مستحسن قدم نہیں تھا۔ اس سے مبہم اور پھیکی شاعری کا چلن عام ہوا وہ لکھتے ہیں:

''میں زندگی کی طرح شعر و ادب میں بھی انقلاب کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔ اس کی ہر نئی شکل، نئے اسلوب، نئے موضوع کو نظر استحسان سے دیکھتا ہوں، لیکن فوراً اس ظاہر کے اندر باطن پر نظر ڈالتا ہوں اور باطن کا ہی تعطر و تعفن میری نظر میں اس کو گوارا یا ناگوار بناتا ہے۔''

مجموعے کا اگلا مضمون ''غزل کی روایت'' ہے۔ قادری صاحب کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ جابجا ہلکی پھلکی اور مزاحیہ مثالوں سے سنجیدہ سے سنجیدہ مضمون میں بھی ظرافت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ مذکورہ مضمون میں یہ عنصر غالب ہے۔ اردو غزل میں خنجر و نشتر، قتل و خون، نزاع و مرگ، زاہد و واعظ، محتسب و ناصح اور جفائے محبوب جیسے موضوعات عام ہیں۔ ان موضوعات پر موصوف نے بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے بطور مثال حسرت کا ایک شعر ہے:

اللہ رے ان کے حسن درخشاں کی گرمیاں
چھالے سے پڑ گئے ہیں زبان سپاس میں

عندلیب شادانی کے حوالے سے قادری صاحب اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

''سبحان اللہ کتنا حسین مبالغہ ہے..... عاشق نے جو محبوب کے حسن کی منت گزاری کی تو حسن کی گرمی سے بے چارے کی زبان جل گئی۔ سپاس حسن گویا دہکتا ہوا ایک انگارہ تھا جسے بھولے شاعر نے ایک معصوم بچے کی طرح منہ میں رکھ لیا اور اس سے بے چارے کی زبان میں چھالے پڑ گئے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ اس وقت وہاں کوئی اور موجود نہ تھا ورنہ یہ آتشیں الفاظ جو سنتا اس کے کانوں میں چھالے پڑ جاتے۔''

پورا مضمون اسی رنگ میں ہے۔ مجموعے کا ایک دلچسپ اور اہم مضمون ''فانی کے نقاد'' ہے۔ فانی اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ لیکن ان کی شاعری پر اعتراضات کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ ان میں عزیز یار جنگ بہادر، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور سیماب اکبرآبادی جیسے لوگ بھی شامل رہے۔ ان حضرات نے لفظی اور معنوی اعتبار سے فانی کی شاعری پر جو اعتراضات کیے ہیں اس سے متعلق قادری صاحب نے عروض و بلاغت اور علم بیان کی روشنی میں اپنے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ بعض قدما کی طرح فانی کے یہاں بھی کچھ لغزشیں ملتی ہیں لیکن ان کی وجہ سے ان کی تمام شعری وراثت کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ قادری صاحب اقبال کے درس خودی کے قائل ہیں اور زندگی اور ادب دونوں میں اس کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہیں۔ اپنے مضمون ''ادب اور زندگی کی قدریں'' میں انھوں نے بڑے

عالمانہ انداز میں اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے۔

''مذہب پر ایک نظر'' بھی قابل مطالعہ مضمون ہے۔ اس میں 'روح' کی مادیت اور غیر مادیت سے متعلق موصوف نے بڑی دلچسپ بحث چھیڑی ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے روح کی اگرچہ کوئی مادّی حیثیت نہیں لیکن اس دنیا میں آئے دن ایسے معجزات رونما ہوتے رہتے ہیں جو اس بات کے اعتراف کے لیے کافی ہیں کہ روح کا وجود ہے اور یہی وہ قوت ہے جس سے حیات و کائنات کے تمام مظاہر ظہور میں آئے۔ اس مجموعے میں کئی دلچسپ اور اہم مضامین شامل ہیں جو اردو زبان و ادب سے لے کر تصوف، تہذیب اور تاریخ کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قادری صاحب کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے۔ جگہ جگہ پُر لطف اور دلچسپ فقروں سے وہ خشک مضامین میں بھی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ کتاب کا گیٹ اپ خوش نما اور طباعت صاف ستھری ہے۔

طرز غالب

مصنف: محمد عرفان

صفحات: 175، قیمت: -/240 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔110006

مبصر: جاوید رحمانی، انجمن ترقی اردو ہند، راؤز ایونیو، اردو گھر، نئی دہلی۔

''طرز غالب'' محمد عرفان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو غالب صدی تقریبات کے موقع پر شائع ہوا تھا، یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس کتاب کے فلیپ پر سندزادالی آسی، ساجد صدیقی، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسین رضوی ادیب، اکبرالدین صدیقی، نسیم قریشی، خلیل الرحمن اعظمی، اسلوب احمد انصاری اور احمد سجاد کی آرا درج ہیں۔ محمد عرفان انگریزی میں شعر بھی کہتے ہیں اور بزبان انگریزی اپنا نام عرفان رومانی لکھتے ہیں۔ وہ واقعی رومانی ذہن رکھتے ہیں اور اس ذہن کی کارفرمائی ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی ملتی ہے۔ مشاہیر کی آرا جو فلیپ پر تحریر ہیں اپنی ارزانی کا مژدہ سناتی ہیں۔ محمد عرفان غالب کے نقاد نہیں غالب کے مداح ہیں۔ ان کی تان '' غالب زندہ باد: اردو ادب پائندہ باد'' پر ٹوٹتی ہے۔ یہ طالب علمانہ ذہنیت ہے اور اس کتاب میں کئی مقامات پر شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ تشنہ ہے۔

وہ پیش لفظ میں غیر ضروری فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ ادب اور فن تعمیر کا جس طرح موازنہ کیا گیا ہے وہ ادب اور فن تعمیر دونوں سے سطحی واقفیت پر مبنی ہے اور زبان تو تنقید کی یکسر نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں قدامت اور روایت پرستی کا آخری قصیدہ لکھا اور خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کے کلام پر ریویو کے ذریعے جدت و ندرت کی پہلی تمہید قلمبند کی۔''

تعجب ہے'' آب حیات'' کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص یہ رائے بھی قائم کر سکتا ہے؟ اور حالی نے اگر جدت و ندرت کی پہلی تمہید لکھی تو ''یادگار غالب'' میں کیوں؟ اور'' مقدمۂ شعر و شاعری'' میں کیوں نہیں؟ '' مقدمۂ شعر و شاعری'' تو '' یادگار غالب'' سے چار سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ '' تنقید ایک فرد کے زاویۂ نظر اور اس کی ذاتی رائے کا اظہار ہے...... یہ ریاضی یا علوم ہندسہ کی طرح ایک مکمل صداقت بھی نہیں ہے۔ یہ ایک نصف صداقت ہے۔ ادب کی دنیا میں ایسی نصف صداقتوں کو جوڑ کر ہی زیادہ سے زیادہ وسیع صداقت حاصل کی جا سکتی ہے۔''

اگر دیکھیں تو '' ریاضی یا علوم ہندسہ'' میں بھی کہاں مکمل صداقت ہے اس کی صداقت کی بنیاد بھی تو فرض کرنے پر قائم ہے۔ پہلا مضمون'' غالب اور دیگر شعرا کے ہم مضمون اشعار'' ہے اس میں وہ کہتے ہیں'' اردو شاعری میں مترادف اشعار کی تعداد کثیر ہے۔ ہم مضمون اشعار کے وجود نے ایک عجیب تصور کو جنم دیا ہے۔'' یہ پوری بحث معنی اور مضمون کی اصلیت ناشناسائی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ دوسرا مضمون'' غالب کے چند استعارات'' سے ہے۔ یہ نسبتاً بہتر ہے اگرچہ اس میں بھی الفاظ، استعارے اور علامتیں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ '' غالب کے یہاں مضامین کی تکرار'' اچھا مضمون ہے۔'' غالب کے یہاں حسرت مرگ اور چند ضمنی مسائل''، '' کلام غالب میں روزمرہ اور محاورہ کا مقام''، '' غالب کے کلام میں اجنبیت اور اشکال'' اور'' غالب کے کلام میں تکرار صوت'' وغیرہ مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔ جب کہ'' طنز و مزاح اور غالب''، '' مرزا غالب جدت کے طالب'' اور'' غالب کی مشکل پسندی'' وغیرہ غالباً روا روی میں لکھے گئے ہیں۔'' مرزا غالب جدت کے طالب'' کی بنیاد ہی اس مفروضے پر رکھی گئی ہے کہ غالب پہلے مشکل گو تھے اور رفتہ رفتہ سہل گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ یہ مفروضہ اب رد کیا جا چکا ہے۔ اس مضمون میں گیان چند جین کو معترضین غالب کی فہرست میں رکھا گیا ہے یہ بھی محل نظر ہے۔

□□□

موصولہ کتب

کہرے کے درمیان (شعری مجموعہ)/سید بشارت علی

صفحات:135، قیمت:-/200روپے

سنہ اشاعت:2006

ناشر: نشاط پبلشرز،20-4-226/9 چوک، حیدرآباد۔500020

رام بھروسے (اردو ڈرامہ)/ہیرالال کول

صفحات:170، قیمت:-/100روپے

سنہ اشاعت:2004

ناشر: وکاس وژن، جی ایف۔3، پلاٹ نمبر22، سیکٹر۔5، ویشالی، غازی آباد۔

معصوم محبت/رحیم رضا

صفحات:36، قیمت:-/30روپے

سنہ اشاعت:2005

ناشر: مصنف، ظہیر خان، مولانا آزاد لائبریری، ڈانگ پورہ، بیاول

نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے/علیم صبا نویدی

صفحات:136، قیمت:-/300روپے

سنہ اشاعت:2006

ناشر: مصنف،26، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، چنئی۔600002

شاہ بے لباس (ترجمہ)/شبیر احمد

صفحات:142، قیمت:-/65روپے

سنہ اشاعت:2006

ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی،75/ZA رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا۔16

قرآن اور سائنسی تحقیقات/شیخ سلیم محمد ایرنڈول

صفحات:56، قیمت:-/25روپے

سنہ اشاعت: جنوری2006

ناشر: مصنف، اسلام پورہ، ایرنڈول، ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)

اردو بک ریویو کے اداریے اور تجزیے/ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات:136، قیمت:-/100روپے

سنہ اشاعت: اکتوبر2006

ناشر: کاغذ پبلشرز، سائبان، زبیر کالونی، ہاگرگہ کراس رنگ روڈ، گلبرگہ، کرناٹک

تصوف کے پانچویں دور کی اجتہادی اساس اور عصری معنویت/ڈاکٹر رحیم الدین کمال

صفحات:60، قیمت: ندارد

سنہ اشاعت: جون2006

ناشر: ہدی بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد (آندھراپردیش)

مسلمانوں کے زوال کا بے بنیاد نظریہ/ڈاکٹر رحیم الدین کمال

صفحات:36، قیمت: ندارد

سنہ اشاعت: جون2006

ناشر: فیض برادران، الریاض، حیدرگوڑہ، حیدرآباد (آندھراپردیش)

شری مدبھگوت گیتا (تفسیر و تعبیر)/ڈاکٹر اجے مالوی

صفحات:233، قیمت:200روپے

سنہ اشاعت:2006

ناشر: مصنف،1/1278، مالوی نگر، الہ آباد، یوپی-211003

شردھا کے پھول/جگندر سنگھ دیپ

صفحات:124، قیمت:100روپے

سنہ اشاعت:2006

ناشر: میوزک سینٹر، 24 کالی ماٹی روڈ، نزد بسنت سنیما، ساکچی بازار، جمشید پور۔

اقبال ایک عاشق رسول کی حیثیت سے/ڈاکٹر محمد ہارون الرشید قادری

صفحات:216، قیمت:100روپے

سنہ اشاعت:2005

ناشر: مصنف، عزیزی کتاب گھر، بزہریا، سیوان، بہار۔

راجا کی جیت/عادل حیات

صفحات:48، قیمت:25روپے

سنہ اشاعت:2005

ناشر: حیات پبلی کیشنز، A-595، امرپوری، نبی کریم، نئی دہلی۔110055

□□□

تحریر: دلیپ ایم. سالوی
ترجمہ: اقبال مہدی زیدی، غلام حیدر

جگدیش چندر بوس

10 مئی 1991 کو لندن میں رائل سوسائٹی کا ہال بڑے بڑے سائنس دانوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ لوگ جگدیش چندر بوس کے وہ تجربات دیکھنے جمع ہوئے تھے جن کے ذریعے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پودے بھی حس یا محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انھوں نے جو تجربات کیے ان میں سے ایک یہ تھا۔ ایک انتہائی حساس قسم کے آلے کو، جسے پودے کی نبض ریکارڈ کرنے کے لیے بوس نے خود ایجاد کیا تھا، ایک پودے سے جوڑ دیا گیا۔ پودے کو بہت احتیاط سے مع اس کی جڑ کے اکھاڑا گیا اور تنے تک ایک برتن میں ڈبو دیا گیا۔ اس برتن میں برومائڈ بھرا تھا جو ایک زہر ہوتا ہے۔ بوس پردے پر روشنی کے اس دھبے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے جو پودے کی نبض کو دکھا رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص یہی کر رہا تھا۔

پردے پر روشنی کا دھبہ اسی طرح آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا جیسے کسی دھاگے سے لٹکا ہوا وزن (پنڈولم) آگے پیچھے جھولتا ہے۔ یہ حرکت پودے کی نبض کی رفتار کو ظاہر کر رہی تھی۔ پھر اس حرکت میں تبدیلی نظر آئی اور آخر وہ کچھ دیر بڑے زور سے ہلا اور پھر ایک دم تھم گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے زہر کھانے کے بعد چوہا زور زور سے سانس لیتا ہے اور اپنے پیروں اور دم کو ادھر ادھر پٹخ کر ساکت ہو جاتا ہے۔ زہر کی وجہ سے پودا بھی مر گیا تھا۔

تجربہ پورا ہونے پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مگر کچھ ماہر عضویات (فزیالوجسٹ) جو بدن کے کسی بھی زندہ عضو کے اندر ہونے والے عمل کا مطالعہ کرتے ہیں، یہ تجربہ دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوئے۔ بوس ایک ماہر فزکس (فزیسٹ) تھے جو فزیالوجی کے میدان میں دخل اندازی کر رہے تھے اور بہت سے مشہور و معروف فزیالوجسٹ جو اس وقت یہ تجربہ دیکھنے آئے تھے، یہ تجربہ ان کے پیش کیے ہوئے بہت سے نظریوں میں بھی خلل پیدا کر رہا تھا۔ انھیں بوس کے اس نتیجے پر اعتراض تھا کہ ''پودے اور دھاتیں بھی زندگی رکھتی ہیں۔'' انھوں نے رائل سوسائٹی پر زور ڈالا کہ جب تک بوس اپنے بیانات میں کچھ تبدیلیاں نہ کریں ان کے لیکچر کو شائع نہ کیا جائے۔ بہر حال بوس یہ تبدیلیاں کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ اسی لیے ان کے تجربات ایک عرصے تک لوگوں کے سامنے نہ آئے لیکن بوس بھی ہار ماننے والے شخص نہیں تھے۔ اپنے بچپن سے ہی انھوں نے ناموافق حالات سے لڑنا سیکھ لیا تھا۔

بوس 30 نومبر 1858 کو میمن سنگھ میں پیدا ہوئے تھے جو اب بنگلا دیش میں ہے۔ ان کا گھرانا ہندوستانی روایات اور رہن سہن کا سخت

''ہندوستان کے سائنس داں'' سے ماخوذ ضخامت. 170 صفحات قیمت : -/30
نوٹ : قومی اردو کونسل کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔
تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

پابند تھا۔ وہ رامائن اور مہابھارت پڑھا کرتے تھے۔ وہ کرن کے کردار سے بہت متاثر تھے جو کامیابی حاصل کرنے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ اس لیے بوس یہ ماننے لگے تھے کہ" ہارنے سے ہی سچی کامیابی ملتی ہے۔"

جب کلکتے میں انھوں نے سینٹ زیویئر اسکول میں داخلہ لیا تھا تو وہاں انھیں یوروپی اور اینگلوانڈین لڑکوں سے سابقہ پڑا تھا۔ ان لڑکوں کو ایک دیہاتی لڑکے کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت مزہ آیا۔ ان میں سے ایک جو کہ بازی (باکسنگ) کا چیمپین تھا جگدیش کو بہت چھیڑا کرتا تھا۔ ایک دن تنگ آ کر جگدیش نے مقابلے کی ٹھان لی۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور جگدیش کسی نہ کسی طرح جیت ہی گئے۔ بس پھر ان کی کلاس کے لڑکے بھی ان کی عزت کرنے لگے۔ پھر کسی نے انھیں چھیڑنے کی ہمت نہیں کی۔

1885 میں وہ ولایت سے بی۔ایس۔سی۔ اور کیمبرج یونیورسٹی سے نیچرل سائنس میں آنرس کی ڈگری لے کر، جسے یونیورسٹی والے "Natural Science Tripos" کہا کرتے تھے واپس آئے۔ کلکتے کے پریسیڈنسی کالج میں انھیں لکچرر کی جگہ رکھا گیا مگر انگریزوں سے آدھی تنخواہ پر۔ بوس نے کام تو کرنا شروع کر دیا لیکن احتجاج کے طور پر تنخواہ نہیں لی۔ تین سال بعد کالج کے انگریز پرنسپل نے ان کا مطالبہ مان لیا اور اسی دن سے جب ان کا تقرر ہوا تھا انھیں پوری تنخواہ ادا کر دی گئی۔

اس طرح بوس نے انصاف کے لیے لڑنا سیکھا۔ اسی لیے جب رائل سوسائٹی میں فزیالوجی کے ماہروں نے بوس کے کام پر تنقید کی تو بوس نے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی، اور آخر وہی جیتے۔ دو سال جم کر تحقیق کرنے کے بعد" زندہ اور بے جان چیزوں میں ردعمل" مضمون میں بوس نے اپنی تحقیقات بیان کیں جن کی وجہ سے رائل سوسائٹی نے تسلیم کر لیا کہ بوس کی بات صحیح تھی۔ ان کے جس لیکچر کی اشاعت روک دی گئی تھی وہ اب چھپا اور دنیا بھر میں تقسیم ہوا۔ بوس اب ایک سائنس داں کی حیثیت سے ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ مختلف ملکوں میں پودوں کی فزیالوجی پر تحقیق ہونے لگی۔ دوسرے بہت سے اعزازات کے ساتھ بوس کو رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔

اپنے چھتیسویں یوم پیدائش پر بوس نے خالص تحقیقی کام میں لگ جانے کی ٹھان لی۔ ہنرک ہرٹز (Heinrich Hertz) اور اس کے کام کو بعد میں جاری رکھنے والوں کے بارے میں اولورلوج (Oliver Lodge) کے لکھے ہوئے مضمون نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ اب جنھیں ریڈیائی لہریں، (ریڈیو ویز) کہا جاتا ہے، ان کی تحقیق بوس نے شروع کر دی۔ اگرچہ کالج سے انھیں کسی قسم کی سہولت یا مالی امداد نہیں ملی پھر بھی تین مہینے کے اندر انھوں نے وہ تمام آلات خود بنا لیے جن کی انھیں ضرورت تھی اور تحقیق شروع کر دی۔ دھات اور لکڑی کے حرفوں کی جو ٹریننگ انھیں بچپن میں ملی تھی وہ اس وقت ان کے بہت کام آئی اور بعد میں اسی تربیت کی بنا پر وہ پودوں کے مطالعے کے لیے بہت ہی حساس قسم کے آلے خود بنا سکے۔

اگرچہ بوس ایک مشہور بیالوجسٹ (جانداروں کے جسموں کا مطالعہ کرنے والے) تھے لیکن وہ ایک ماہر فزکس داں (فزیسٹ) بھی تھے۔ اصل میں ان کو وائرلیس ٹیلی گرافی (تاروں بغیر پیغام رسانی) کا موجد بھی مانا جانا چاہیے۔ 1895 میں جب گگ لیلمو مارکونی نے

اپنی ایجاد کو پیٹنٹ (رجسٹر) کروایا ہے، اس سے ایک سال پہلے ہی انھوں نے لوگوں کے سامنے اس طریقے کو کام کرتے دکھا دیا تھا۔ وہ ایسا آلہ بنانے والے پہلے شخص تھے جو ''مائیکرو ویو'' (بہت چھوٹی لہریں) پیدا کرسکتا تھا۔ یہ بہت تھوڑی دوری (شارٹ ویولینتھ) ریڈیائی لہریں تھیں۔ کسی مادے کی اندرونی ساخت (بناوٹ) سمجھنے کے لیے ان مائیکرو ویوز کو استعمال کرنے والے بھی یہ پہلے شخص تھے۔ انھوں نے ایک آلہ بنایا تھا جسے اب ویو گائڈ کہتے ہیں۔ یہ آلہ بجلی یا نیوکلیائی ساز وسامان کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔

بوس نے ایک بہت ہی حساس ''کوہرر'' (Coherer) بھی بنالیا۔ یہ وہ آلہ ہوتا ہے جو ریڈیائی لہروں کو پکڑتا ہے۔ دراصل اس پر بہت گہری تحقیق کرنے کی وجہ سے ہی وہ فزکس سے دھاتوں اور پھر پودوں کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر کوہرر کو بہت دیر تک استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی حساسیت (سینسٹیوٹی) کم ہونے یا کمزور ہونے لگتی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ تھک جاتا ہے اور پھر جب وہ اسے آرام کرنے کا موقع دیتے ہیں تو اس کی حساسیت واقعی بڑھ جاتی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دھاتوں میں احساس اور یادداشت ہوتی ہے۔ وہ دھاتیں جو روزانہ استعمال کی جاتی ہیں مثلاً چاقو چھری وغیرہ، وہ مرتے نہیں جاتے بلکہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جیسے وہ شخص جسے بہت مارا پیٹا گیا ہو۔ وہ اپنی بے ہوشی کی حالت میں اس وقت آتے ہیں جب انھیں تپایا جاتا ہے۔

بوس نے کئی حساس آلے خود بنائے۔ سب سے حیران کن آلہ ''کیلوگراف'' تھا۔ یہ وہ آلہ تھا جو پودوں کے بڑھنے کی رفتار کو ناپتا تھا۔ یہ کتنا حساس تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پودوں کے بڑھنے کی اس رفتار کو بھی ناپ لیتا تھا جو گھونگے کی رفتار کا 20,000 واں حصہ ہوتی ہے۔

جانداروں کی برقی نوعیت (الیکٹرک نیچر) کی بنیاد پر بوس اس نتیجے پر پہنچے کہ پودوں اور دھاتوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ جب بدن کے کسی حصے میں درد ہوتا ہے تو اعصاب اس اطلاع کو بجلی کے سگنلوں کے ذریعے دماغ تک لے جاتے ہیں۔ اس طرح اگر ایک ہاتھ کو ہلانا چاہیں تو دماغ یہ پیغام بجلی کے سگنلوں کے ذریعے ہی بھیجتا ہے۔ اسی طرح ایک جانور کا دل، دماغ اور اعصاب بجلی کے سگنلوں پر کام کرتے ہیں۔ بوس نے تجربہ کرکے یہ دکھایا کہ اگرچہ پودوں کے دل، دماغ، اعصاب نہیں ہوتے مگر ان میں چھوٹے چھوٹے خلیے (سیل) ہوتے ہیں جو ان کی طرح کام کرتے ہیں۔ ایک پودے اور ایک جانور کے ردعمل میں جو فرق ہوتا ہے وہ صرف وقت کا ہوتا ہے۔ پودے میں ردعمل دیر سے ہوتا ہے۔

اگرچہ بوس نے زیادہ تر تجربات کلکتے میں کیے لیکن ان کے وطن کے بہت کم لوگوں نے ان تجربات کی اہمیت کو سمجھا، سوائے مہاتما گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور اور وویکانند کے۔ ملک میں ان کے کام کی قدر اس وقت ہوئی جب مغربی دنیا نے ان کی اہمیت کو تسلیم کرلیا۔

جگدیش چندر بوس کا انتقال 23 اکتوبر 1937 کو ہوا۔ اس سے پہلے انھوں نے کلکتے میں بوس انسٹی ٹیوٹ قائم کرلیا تھا۔ اس ادارے میں خاص طور پر پودوں کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ آج یہاں دوسرے بہت سے متعلقہ موضوعات پر بھی تحقیقی کام چل رہا ہے۔

□□□

پروفیسر علی احمد فاطمی مقالہ پڑھتے ہوئے۔ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں (دائیں سے) پروفیسر سید عقیل رضوی، ڈاکٹر قمر جہاں، پروفیسر اصغر عباس اور ڈاکٹر احمد محفوظ۔

سیمینار میں شریک ادب دوست اور ادب شناس سامعین میں ڈاکٹر فخر الکریم، جناب شمس الرحمن فاروقی، محترمہ جمیلہ فاروقی، جناب اسرار گاندھی، جناب پرویز شہریار، پروفیسر شہناز نبی اور جناب فضیل جعفری کو دیکھا جا سکتا ہے۔

پچھلے دنوں جناب پرویز شہریار کو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کا عہدہ سنبھالنے پر قومی اردو کونسل کے دفتر میں استقبالیہ دیا گیا جس میں قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر انچارج محترمہ رشمی چودھری نے بھی شرکت فرمائی۔ پیچھے کھڑے ہیں (بائیں سے) ڈاکٹر کلیم اللہ، محترمہ شمع کوثر یزدانی، محترمہ مسرت جہاں اور جناب شہنواز محمد خرم۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/02/2007

URDU DUNIYA Monthly, March 2007, Vol. 9, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زر سالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈنری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈنری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Rashmi Chowdhary, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Rashmi Chowdhary, Tel : 26103381, 2610393